افسانے

از

خالدہ انور

بجھ رہے تھے چراغ محفل کے

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو موہے پیا ملن کی آس

وہ دسمبر کی ایک لطافت آمیز اور خوش گوار دوپہر تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی کسی درخت پر ایک آدھ پرندہ اپنی نازک اور سریلی آواز سے بول اٹھتا یا ایک ٹہنی سے اُڑ کر دوسری ٹہنی پر جا بیٹھتا تھا جس سے پتّوں میں ایک خفیف اور لطیف سی سرسراہٹ پیدا ہو جاتی تھی یا پھر بنگلے کے اندر سے کوئی انسانی آواز خاموش فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔

کئی دنوں کے بعد آج سورج نے بادلوں کا نقاب اُلٹا تو پوری کائنات منوّر ہو گئی۔ ہمارے بنگلے کے چھوٹے سے لان میں اُجلی اور نکھری نکھری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

بھابی اپنے بچوں کے ہمراہ کسی عزیز کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ میری تنہائی پسند طبیعت عموماً ایسی تقریبات کے ہنگاموں سے گھبرا جاتی ہے اس لیے تقریبات میں بہت کم جاتی ہوں۔ آج بھی میں گھر پر ہی تھی۔ لہٰذا میں اُن کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے افسانے کا پلاٹ سوچنے لگی۔ دماغ میں دو تین پلاٹ ابھرے مگر ذہن میں کوئی ڈھنگ سے نہ جم سکا۔ میں نے جھنجھلا کر کاپی اور قلم میز پر پھینک دیا اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگائے سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔

بجلی کے کھمبے پر ایک نیل کنٹھ گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ سامنے چند چڑیاں مسرت سے پر پھیلائے دھوپ کا غسل لے رہی تھیں۔ اچانک میرے کانوں میں کسی کے گنگنانے کی آواز آنے لگی۔

میں دکھ کی رات ہوں ایسی
سویرا دور ہے جس کا

یہ باجی مریم کی آواز تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی دُکھ بھرے انداز میں گنگنا رہی تھیں ان کی آواز میں سوز و گداز بھرا ہوا تھا۔ آہ باجی مریم! ان کا خیال آتے ہی میری آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور میں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگی۔

☆

باجی مریم ہماری پروفیسر مسز غوری کی بیٹی تھیں۔ آج سے تقریباً چھ سال قبل باجی مریم ہمارے کالج کی مقبول ترین ہیروئن تھیں اپنی حسین غزالی آنکھوں، بے مثال آواز اور ذہانت و خوش گفتاری کی وجہ سے پورے کالج میں ہر دل عزیز تھیں۔

کوئی ڈراما کوئی فنکشن مریم کی شرکت کے بغیر کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ ان کا کردار ان کے چہرے کی طرح بہت حسین تھا اور ان کی گفتگو میں بھی بہت دل کشی ہوتی تھی۔ تقاریر کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتیں، اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتیں۔ تلاوت اتنی خوش الحانی سے کرتیں کہ سننے والوں کو کانوں میں رس سا گھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور دلوں میں عقیدت کے پھول کھل اٹھتے تھے۔ مریم کالج کی کرکٹ ٹیم کی کپتان تھیں ان کے کھیلنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ کریز پر کھڑی ہوتیں تو ہر گیند پر چھکے اور چوکے لگاتیں۔ چوکا لگاتے وقت تھوڑا سا گھٹنے کو ٹیک کر بیٹ سے گیند کو ٹکراتیں تو گیند شوں کرتا ہوا تیزی سے باؤنڈری لائن کو پار کر جاتا اور جب چھکا لگاتیں تو بیٹ کے ساتھ خود گھوم جاتیں اور گیند تیزی سے بلند ہوتا ہوا تماشائیوں کے سروں پر جا گرتا۔ یہ مشکل کریز پر آدھا گھنٹا ٹھہرتیں اور ہاف سنچری بن جاتی۔ اس پر شائقین سے انھیں بے پناہ داد ملتی۔

لیکن آہ! یہ سب ماضی کی باتیں تھیں اب تو باجی مریم کا حسن زوال پزیر ہو چکا تھا۔

بجھ رہے تھے چراغ محفل کے

ان کے چہرے کی تاب ناکی ختم ہو چکی تھی اور ان کی دل کش آنکھیں اپنا نور کھو چکی تھیں اور اب تو وہ ایک ایسے ٹوٹے ہوئے ساز کی مانند تھیں جس کے تمام نغمے دم توڑ چکے تھے۔ باجی مریم کے گانے کی دردناک لے فضا میں اُبھر رہی تھی۔ میں اٹھ کر ان کے کمرے میں گئی اور انھیں سہارا دے کر باہر لے آئی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''نغمہ! تم شادی میں کیوں نہیں گئیں؟''

''مجھے شادی سے سخت نفرت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ارے یہ تم اپنی شادی کا ذکر کہاں سے لے بیٹھیں میں تو اس شادی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جہاں بھابی گئی ہیں۔'' باجی نے غمگین سی مسکراہٹ سے کہا۔

میں قدرے جھینپی اور پھر مسکرا کر بولی۔

''دراصل باجی! میں ایک مقامی ماہنامہ کے لیے افسانہ لکھنا چاہتی ہوں مگر میرا ذہن ان دنوں کچھ منتشر سا ہے۔ سوچتی ہوں اگر اب بھی کوئی افسانہ نہ لکھ سکی تو مدیرہ صاحبہ کا پانچواں فرمائشی خط آجائے گا۔'' میں نے باجی مریم کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''نغمہ! تم میری زندگی کو قلم بند کر ڈالو'' وہ کچھ توقف کے بعد اپنی بے نور آنکھوں کی پلکیں اٹھا کر بولیں۔

ان کی صورت دیکھ کر مجھے شدید صدمہ ہوا اور دل پر ایک کاری ضرب سی لگی۔

''آپ کی زندگی پر؟'' میں کسی سوچ میں پڑ گئی۔

''ہاں میری زندگی... سسکتی ہوئی زندگی، رنج و الم سے پُر زندگی، حزن و ملال سے بھرپور اور بلکتی ہوئی زندگی... ہاں یہ زندگی ہی تو ہے۔'' ان کی نابینا آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''باجی! آپ روتی ہیں تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔''

''نغمہ! آنسو زندگی کی تلخیوں پر بھی بہائے جاتے ہیں اور مسرت و شادمانی پر بھی لیکن انسان کی زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آجاتے ہیں جب آنسو پلکوں کی نوک پر ہی اٹک

کررہ جاتے ہیں اور پھر بعض اوقات گرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

"میں آپ کی داستان غم سننے کے لیے کافی دنوں سے بے چین ہوں۔ سنا ہے، ایک رنجیدہ، بے بس انسان اگر اپنا دکھ کسی سے کہہ دے تو اس کا دُکھ آدھا ہوجاتا ہے۔"

"آہ! یہ دکھ ایسا نہیں جو آدھا ہوسکے۔ نغمہ! سنو، آج میں تمھیں اپنی داستانِ الم سناتی ہوں۔

☆

وہ ایک طوفان خیز تاریک رات تھی۔ امی بستر مرگ پر پڑی تھیں اور میری نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں گویا وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

چراغ سحری ہوں پو پھٹنے سے پہلے ہی بجھ جاؤں گی

"ماں... ماں! خدا را ایسا مت کہیے آپ کے بغیر ہماری دنیا ویران ہوجائے گی۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔"

"یوسف ابھی تک نہیں آیا؟" ماں کی نحیف آواز نکلی۔

"یوسف بھائی تو دوا لینے گئے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔" میں نے پُرنم نظروں سے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

باہر سخت اندھیرا تھا۔ بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے دل ہول کھا رہا تھا۔ کتنی اداس تھی رات۔ دکھوں بھری رات۔ بارش سسکیاں بھر رہی تھی۔ ہوا کراہ رہی تھی۔ گیدڑ رو رہے تھے۔ سامنے بستر پر امی درد سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ تکلیف کی زیادتی سے ان کا چہرہ بالکل زرد تھا یوں لگتا تھا جیسے درد نے تمام خون چوس لیا ہے۔ میں حسرت و یاس بھری نگاہوں سے امی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اگر میرا بس چلتا تو امی کے جسم سے اس تکلیف کو کھینچ کر اپنے جسم میں جذب کرلیتی۔ اُف میرے معبود! اتنی تکلیف، اس درجہ کرب میری امی کیوں کر برداشت کرسکیں گی؟ میرے مولا۔ میرے اللہ کرم کریں۔ رحم کیجیے، دکھے دل کی التجا ہے اسے شرف قبولیت عطا فرمائیں۔

ہر آہٹ پر میری بے چین نظریں دروازے کی جانب اُٹھ جاتی تھیں۔ میں بے چینی

سے یوسف بھائی کا انتظار کر رہی تھی وہ امی کے لیے دوا لینے گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے امی کا مکمل معائنہ کرنے کے بعد ایک دوا تجویز کی تھی اور امی کے بچنے کی بس مبہم سی امید دلائی تھی۔

"نغمہ بٹی! اب دوا کی نہیں بلکہ دعا کی ضرورت ہے۔ اب موت کے آہنی پنجوں سے مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔" ماں کی آواز میں بہت زیادہ دُکھ اور کرب تھا۔

"نہیں امی! مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور تندرست ہوجائیں گی۔ خدا ہم پر اس درجہ ستم آرائی نہیں کرے گا، وہ ہمیں بے سہارا نہیں کرے گا۔"

میں نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ماں کے پریشان بال سنوارے۔ ان کی پیشانی عرق آلود تھی اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہوکر رہ گیا۔

"بیٹی مریم! دریچے کھول دو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔" امی انتہائی نحیف آواز میں بولیں۔

"امی! باہر تو طوفان نے ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اگر دریچہ کھول دیا تو تیز آندھی جلتی ہوئی شمع کو گُل کردے گی جسے میں نے بڑی کاوشوں کے بعد جلایا ہے۔"

"کیوں برقی لائٹ نہیں ہے کیا؟"

"اس کا فیوز تو طوفان کی وجہ سے اُڑ چکا ہے۔"

"اٹھے ہوئے طوفان کو کوئی نہیں روک سکتا یہ شمع، گل ہوکر رہے گی۔" امی کی نظریں شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو پر جم گئیں۔ "بیٹی! شمع کے اس پار تمھیں کیا نظر آرہا ہے؟" امی کے کمزور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے اُدھر نظریں جمائیں۔ "صرف شمع کے اردگرد پتنگوں کے پنکھ بکھرے پڑے ہیں۔"

"تمھارے ابا کھڑے مجھے بلا رہے ہیں۔" ان کا چہرہ کسی معصوم بچے جیسا لگ رہا تھا۔

"امی جانی! خدارا ایسا مت کہیں۔ غم سے میرا سینہ شق ہوا جا رہا ہے۔" میں نے روتے بلکتے ہوئے اپنا سر امی کے سینے پر رکھ دیا۔

"آج میری روح ابدی سکون ڈھونڈنے کی خاطر ہمیشہ کے لیے اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔ مگر مجھے اس بات کا افسوس قبر میں چین نہیں لینے دے گا کہ میں اپنے ہاتھوں سے تمھیں دلہن نہ بنا سکی۔" انھوں نے آہستہ آہستہ میرے سر کو سہلانا شروع کیا۔

"ماں! میری زندگی بھی آپ کو مل جائے ماں۔"

میری آنکھوں سے سیلابِ اشک ممتا کے دامن کو تر کر رہا تھا۔ تیرگی کے سایوں نے میرا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔

رات بہت بھیانک تھی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا اور سناٹا تھا، البتہ آوارہ ہوا کے جھونکے کھڑکیوں سے سر پھوڑ رہے تھے۔

یوسف بھائی صبح کے گئے ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ میرا دل بہت بے چین تھا۔ آسمان سے پانی کی دھارا برس رہی تھی۔ ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ آسمان پر بجلیاں کڑک رہی تھی۔ دیوقامت درخت تنکوں کی طرح لرز رہے تھے۔ فرطِ گریہ سے میرا جسم لرزہ براندام تھا اور میں خاموشی سے امی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ نیم وا نگاہوں سے شمع کی جانب ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں۔ آنکھیں ایک ہی زاویہ پر رکی ہوئی تھیں۔ ان کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ شدت درد سے انھوں نے آنکھیں موند لیں۔ ان کے لب برف کی دو چھوٹی چھوٹی ڈلیوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔

میں چلا اٹھی۔ "ماں... ماں جانی... ماں۔"

اچانک دروازہ کھلا اور سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے یوسف بھائی داخل ہوئے۔

"امی! میں دوا لے آیا ہوں۔ اب تم بچ جاؤ گی۔ ماں! میں دوا کے پیسے پورے کرنے کے لیے تمام دن خوب محنت مشقت کرتا رہا ہوں۔ میری جیب میں کم پیسے تھے جب کہ دوا زیادہ پیسوں کی تھی اس لیے مجھے محنت مزدوری کرنا پڑی اور گھر آنے میں مجھے اسی لیے دیر ہوئی۔ بھیا پیالی میں دوا انڈیل کر لے آئے۔ اور جھک کر امی جانی کو سہارا دیا۔

"تم آ گئے بیٹے! بس تمھارا ہی انتظار تھا میرے بچے۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں ہے تم مریم کو اتنا ہی عزیز رکھنا جتنا میری زندگی میں رکھا کرتے تھے آج تک تم اس

کے بھائی تھے اب ماں اور باپ بھی ہو۔ مریم سے محبت کرو گے تو میری روح خوش رہے گی ورنہ قیامت تک میری روح تڑپتی رہے گی۔ میرے بچو... اللہ... مالک۔"

اور پھر چند ثانیوں بعد امی نے بھیا کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اس رات سے ہماری زندگی میں تلخیاں گھل گئیں۔ ہم نے کیسے کیسے حسین خواب دیکھے تھے جن کی خوب صورت لڑیاں آناً فاناً ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ امنگیں دل ہی دل میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ گئیں۔ ماں کی موت کے گہرے نقش سینے میں جم گئے جو مٹائے نہ مٹ سکے۔ باہر کا طوفان تھم چکا تھا لیکن ہماری زندگی کے دُکھ درد اور آلام و مصائب کے طوفان نے شروعات کر دیں۔

اگلی صبح جب امی حضور کو سفید چادر میں لپیٹ دیا گیا تو میری چیخیں نکل گئیں۔

"مت جاؤ... مت جاؤ، ماں... اپنی مریم کے پاس لوٹ آؤ۔" مگر وہ چار آدمیوں کے کاندھوں پر سوار اگلی منزل کی طرف چل دیں۔

ایک دن جب سورج غروب ہو رہا تھا اور درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ میں اس جگہ جا پہنچی جہاں امی آسودہ خاک تھیں۔ میں نے امی کی آخری آرام گاہ پر پھول چڑھائے اور میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں اس مٹی کے تودے سے لپٹ کر اس میں جذب ہو جاؤں۔ میرے ہاتھ ماں کی قبر تھے اور میں اس سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی، بس یہ ہے وہ آخری جگہ جہاں پہنچ کر منزل ختم ہو جاتی ہے۔ خواہشات کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اُف یہ جیون کتنا دکھی ہے۔ وہ لمحے وہ یادیں میری نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ جب امی جانی اس دنیا کی زینت تھیں۔ آہ! وہ کتنے حسین لمحات تھے۔ اب تو صرف ان کی یاد باقی ہے اور ان گزشتہ ایام کی کسک اور خلش دل کو بے چین کر رہی تھی۔

میں قبر کے ساتھ لپٹی رہی اور آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بہتی ہوئی مٹی میں جذب ہونے لگیں۔

"مریم! تم نے میرے ساتھ کیا وعدہ کیا تھا؟" بھیا نے مجھے قبر پر سے اُٹھاتے

ہوئے کہا۔

''میں نے بھیا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی پلکوں پر اشک لرز رہے تھے۔

''یوسف بھائی! ہمیں خبر نہ تھی کہ امی اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائیں گی۔ کاش! گیا وقت پھر سے لوٹ آئے۔'' یہ کہتے ہوئے میں دوبارہ امی کی قبر سے لپٹ گئی۔

''ماں! پیاری ماں صرف ایک بار اپنی پیاری آواز میں ''مریم بیٹی'' کہہ کر پکارو نا! ہاں صرف ایک بار ماں! یہ الفاظ سننے کو کان ترس رہے ہیں۔''

''مریم! میری عزیز بہن! نادان نہ بنو تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ زندگی میں امی نے کتنے دُکھ اور تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ ہمیں پالنے پوسنے کے لیے کالج میں ملازمت کی اور انتہائی محنت اور جان فشانی سے اپنی طالبات کو پڑھاتی رہیں۔ کالج سے ملنے والی اس تنخواہ سے انھوں نے ہماری پرورش کی اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور ہم کتنے نالائق ہیں کہ ان کو آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔ میری بہن! ذرا سوچو تو سہی کہ تمھارے رونے کی آواز سن کر امی کی روح کتنی تڑپتی ہوگی۔ انھوں نے کبھی ہمیں افسردہ نہیں ہونے دیا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کی مغفرت کے لیے دعا تو کریں۔''

میں کھڑی ہوگئی۔ تمام جسم شدتِ غم کی وجہ سے لرزہ براندام تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو لب کپکپا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے رواں تھے۔

''اب واپس چلنا چاہیے اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔'' یوسف بھائی رقت بھری آواز سے بولے۔

''خدا کی رحمتیں ان پر نازل ہوں۔'' میں نے قبر پر آخری نگاہ ڈالی اور پھر ہم اداس اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیے۔ راستہ بھر ہم خاموش رہے۔ مرنے والی کی مقدس یاد ہمارے دلوں پر حاوی تھی۔

گھر پہنچ کر بھیا نے مجھے کرسی پر آرام سے بٹھایا اور پھر ٹشو پیپر سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔

''مریم! خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ تم نے اپنی یہ حالت کیا بنالی ہے؟''

میں نے گلوگیر آواز سے کہا۔

''بھائی جان! امی کے بغیر یہ گھر کتنا سُونا سُونا لگ رہا ہے۔ بعض اوقات وفورِ جذبات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماں کی جدائی سے میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ ماں کے بعد مجھے گھر میں سناٹا اور روح فرسا تنہائی محسوس ہوتی ہے جیسے یہ گھر نہیں کوئی اُجڑا ہوا دیار ہو۔ میں تو ایسی زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔''

''کفر کے کلمات منہ سے نہ نکالو۔ تم شاید سمجھتی ہو کہ اس طرح تم اپنی زندگی ختم کرلوگی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنی صحت برباد کرنے سے انسان مر جائے ہاں جیون بھر کے لیے مریض ہو کر عذابِ جان ضرور بن جاؤ گی۔ اللہ اپنی مصلحت آپ جانتا ہے تم سمجھ دار ہو کر مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔''

میں کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔ واقعی مجھ کو زندگی جیسی نعمت کی قدر کرنا چاہیے۔

''میری بہن! تمھیں افسردہ نہیں ہونا چاہیے میں ہوں ناں! تمھیں کوئی غم نہیں کرنا چاہیے میں تمھارا بھائی بھی ہوں اور باپ بھی۔ بڑے بھائی، باپ ہی تو ہوتے ہیں نا۔''

''ہاں بھیا! میں جانتی ہوں اسی لیے جی بھی رہی ہوں ورنہ یہ غم تو میری جان لے چکا ہوتا میں نے محبت اور عقیدت سے مغلوب ہو کر بھائی کے ہاتھوں کو لبوں سے لگالیا۔

''مریم! کیا تم آج اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر نہ کھلاؤ گی۔ ماسی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے میں تو مزہ ہی نہیں آتا۔''

''ابھی لائی بھیا!''

یہ کہہ کر میں کچن میں آئی۔ امی کے انتقال کے بعد گھر کا تمام شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ ادھر میری بیماری اور بھیا کی پریشانی سے آنے جانے والوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اب ماسی من مانی کر رہی تھی۔ میں نے سوچا یوں ہاتھ پاؤں چھوڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ گھر کے کام کاج کرنا میرا ہی فرض اور ذمہ داری ہے اتنی قلیل آمدنی میں گھر کے تمام اخراجات کھینچ تان کر مجھے ہی پورے کرنے ہوں گے۔ پہلے تو امی کی تنخواہ اور مکان کے کرایہ سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور اب تو کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں رہا تھا۔ جب تک بھیا کو کوئی سروس نہیں

ملتی اسی طرح تنگ دستی سے گزارہ کرنا تھا اور صرف مکان کے کرایہ ہی سے گھر چلانا تھا۔ امی جانی بھولنے والی ہستی نہ تھیں۔ جب تک میں زندہ ہوں ان کی بیش بہا یادیں میرا قیمتی سرمایہ ہے اور ان کی ستودہ صفات اور اخلاق میرے لیے رہنما کا کام دے گی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے گھر کے کام کا انتظام خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔

ٹرے میں کھانا لگا کر میں بھیا کے کمرے میں پہنچی اس دوران انھوں نے کمرے کو خوب صاف کر کے دلہن کی طرح سجا لیا تھا اور بڑے ٹھاٹھ سے بستر میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

''بھیا! آپ نے کیوں کمرہ صاف کیا۔ ماسی آکر کرلیتی۔'' میں نے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے ماسی کو نکال دیا ہے۔ کیوں کہ وہ ہماری نرمی کا فائدہ اٹھا کر ہمیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔ دُکھ، ابتلا اور آزمائش کی کٹھن گھڑیاں ہم دونوں نے مل کر بانٹی ہیں۔ تمھاری آنکھوں میں آنسو کی چمک کی بجائے مسرت کی چمک نظر آنی چاہیے۔'' بھیا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ٹھیک ہے بھیا!'' میں نے تشکر آمیز نظروں سے بھیا کی جانب دیکھا۔

ہم دونوں خاموشی سے کھانا تناول کرنے لگے منھ میں نوالہ ڈالتے وقت میری نظریں امی کی تصویر پر جم گئیں اور لقمہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اچانک بھیا بولے۔

''اوہو! آج تو میں ایک خوش خبری دل میں چھپائے پھر رہا ہوں۔'' یوسف بھائی نے غالباً مجھے خوش کرنے کے لیے کہا۔

''خوش خبری! ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہم کوئی مسرت کا نغمہ سن سکیں۔'' میں نے پُرنم نگاہوں سے بھیا کی طرف دیکھا۔

''یوں نہ کہو۔ خدا بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ اس قادر مطلق کے رنگ نرالے ہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے اور اس نے ہماری بھی سن لی ہے تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔'' بھیا نے خوش خبری سنائی۔

''سچ بھیا! خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن اب افسوس ہو رہا ہے کہ یہ ملازمت کیوں ملی۔'' بھیا اچانک بولے۔

''کیا ہوا بھیا!'' میں پریشان ہوگئی۔

''چھ ماہ ٹریننگ کے لیے کوئٹہ رہنا پڑے گا۔'' وہ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

''تو اس میں نروس ہونے کی کون سی بات ہے؟''

''مریم! تم یہ چھ ماہ کیسے گزارو گی؟''

''میں آپ کی یاد کو سینے سے لگائے اور آپ کی کامیابی و کامرانی کے لیے دعائیں مانگتے مانگتے بسر کرلوں گی۔ صرف چھ ماہ ہی تو ہیں۔'' میں کہنے کو تو یہ کہہ گئی مگر میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ چھ ماہ تو چھ ماہ، میں تو ایک دن بھی بھیا کی جدائی برداشت نہ کرسکتی تھی۔

''مریم! تم پر تو مجھے بھروسا ہے مگر یہ دنیا والے تمھیں کھا جائیں گے، تمھارا جینا دوبھر ہوجائے گا۔ تمھاری زندگی کی ناؤ ڈگمگا جائے گی۔ نہیں! نہیں! میری زندگی میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں سروس نہیں کروں گا۔ میں اپنی ہر خواہش اور تمنا کو نثار کردوں گا۔ اپنے گلستان زیست سے تمام پھول چن کر تمھارے لیے مسرتوں کے گجرے تیار کروں گا۔ تمھارے لیے تاب نا کی حاصل کروں گا۔ تاکہ تم بھائی کے دامان محبت میں رہ کر ماں باپ کی محرومی محسوس نہ کرسکو۔''

''نہیں بھیا نہیں۔ بہن کی محبت اتنی بڑی قربانی اور ایسا ایثار نہیں چاہتی۔ آپ کے مستقبل کو تاریک کر کے میں کبھی خوش نہ رہ سکوں گی۔ آپ ضرور ملازمت پر جائیں گے۔'' میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ نکلا۔

''مگر تمھارا کیا ہوگا میری عزیز بہن!'' بھیا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''مجھے دادا ہمایوں کے ہاں چھوڑ آئیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''دادا ہمایوں...! خیال تو برا نہیں۔ مگر دنیا کیا کہے گی۔''

''دنیا تو سگے بہن بھائی کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ دادا ہمایوں کوئی غیر تو

نہیں ہیں۔'' میں نے خالی برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''دادا جان کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ ان پر مزید بار ڈالنے کو دل نہیں چاہتا مگر مجبوری سب کچھ کروا رہی ہے۔ خیر تم تیار ہو جاؤ۔ میں صبح تمھیں چھوڑ کر سیدھا کوئٹہ چلا جاؤں گا۔'' یوسف بھیا نے کہا۔

اگلی صبح ہم دادا ہمایوں کے گھر کی طرف نکل پڑے۔ ان کا گھر یہیں اسلام آباد میں چند میل کے فاصلے پر تھا۔ طویل چکر کاٹ کر دادا ہمایوں کے گھر پہنچ گئے وہ رشتے میں ابا مرحوم کے چچا لگتے تھے۔ کچھ خاندانی جھگڑوں کی بنا پر کافی عرصے سے میل جول بند رہا تھا مگر ابا جان کی وفات کے بعد جب امی جانی کو چاروں طرف سے مصیبت و آلام نے گھیر لیا تھا تو دادا ہمایوں ہی ایک ایسے انسان تھے جنھوں نے امی جانی کی منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کو ساحل پر لگایا تھا۔ ان کی وساطت سے امی جانی کو سروس ملی تھی وہ خود بھی سال میں ایک دو بار آ کر ہماری غمزدہ زندگی میں مسرت کی لہر دوڑا دیا کرتے تھے۔ امی کے بعد وہ ہماری کافی مالی امداد بھی کر چکے تھے۔

مریم اپنی طویل داستانِ الم کہتے کہتے پہلی بار رکیں اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر خاموش ہوگئیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی طویل داستان سناتے سناتے تھک گئی ہیں اور اب کسی الجھن اور عالمِ یاس میں مبتلا ہیں۔

''ہاں تو پھر...'' وہ ایک طویل ٹھنڈا سانس لے کر دوبارہ کہنے لگیں۔

''وہ میری زندگی کی عجیب سی شام تھی جب ہم دونوں مری روڈ پر دادا ہمایوں کے بنگلے پر پہنچے۔ ایک بڑے سے گیٹ میں ہماری ٹیکسی داخل ہوئی۔ بوڑھے چوکی دار نے ہماری رہنمائی کی۔ چودھویں کا چاند اُفق پر مسکرا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی باغ کے وسیع لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ مختلف اقسام کے پھولوں کی خوش بو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی عطار کی دکان میں گھس گئے ہیں۔

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ گھاس پر جمی اوس پاؤں کے ذریعے سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑا رہی تھی۔ گو کہ گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن اس کے

باوجود دانت سے دانت بج رہے تھے۔ ہم باغ کو عبور کر کے شان دار بنگلے میں پہنچے تو دیکھا کہ ٹی وی لاؤنج میں دادا جان آتش دان کے سامنے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک سبک سی قبول صورت لڑکی بیٹھی نیٹنگ کر رہی تھی یہ دادا ہمایوں کی بیٹی ناہید تھیں۔ دادا ہمایوں نے ہم سے مل کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔

''ادھر آؤ ناہید بیٹی! دیکھو یوسف میاں اور ان کی بہن مریم آئی ہے۔ دادا جان نے ہمارا تعارف کروایا۔ میں نے مسکرا کر اور بڑی گرم جوشی سے ناہید باجی سے ہاتھ ملایا۔

ہم دونوں آگ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے سردی کی وجہ سے رگوں میں جو خون منجمد ہو رہا تھا وہ اب آگ کی تمازت سے متحرک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ناہید ہماری خاطر مدارت میں لگ گئی۔

اگلے روز یوسف بھیا کو کوئٹہ جانا تھا۔ چناں چہ رات کا بیش تر حصہ ان کی روانگی کی تیاری میں گزر گیا۔

آج یوسف بھائی کوئٹہ جا رہے تھے۔ جلدی جلدی ان کی تیاری مکمل کرائی اور پھر میں نے روتے ہوئے یوسف بھیا کو الوداع کیا۔ جاتے جاتے وہ مجھے تسلیاں اور دلاسے دیتے رہے اور میں خاموش تماشائی بنی انھیں جاتے دیکھتی رہی۔

☆

نہ جانے کیوں بھیا کے جاتے ہی میرا دل ڈوبنے سا لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس بھری پُری کائنات میں تنہا اور بے یار و مددگار ہو گئی ہوں۔ غالبًا آنے والے حوادث مجھ پر اپنا مہیب سایہ ڈال رہے تھے۔ دادا ہمایوں کے یہاں آ کر امی کی یاد بڑی شدت سے تڑپانے لگی۔ ماں کا پیار دنیا میں ایک اَن مول نعمت ہے۔ ایک ایسا شجر جس کی گھنی و ٹھنڈی اور راحت بخش چھاؤں میں بیٹھتے ہی تمام تکلیفیں اور کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ لیکن وائے افسوس... کہ میں اس چھاؤں کی راحت سے محظوظ ہو ہی رہی تھی کہ بے رحم موت نے اپنے آہنی ہاتھ بڑھا کر مجھ سے یہ آسودگی اور راحت چھین لی۔ دل جوئی کے لیے دادا ہمایوں کے گھر میں ان کی بیٹی، ناہید باجی تھیں، وہ خود بھی ماں کی نعمت سے محروم تھیں۔ دادا ہمیشہ مجھ سے

بہت شفقت و محبت سے گفتگو کرتے تھے مگر اس کے باوجود میں زندگی کی اس عظیم محرومی کو فراموش نہ کر سکی۔

ایک رات میں ناہید باجی کے کمرے میں بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔ آتش دان میں پڑے انگارے دہک رہے تھے ان کی تمازت سے باجی کے گال سرخ گلاب کی مانند کھلے ہوئے تھے۔

''مریم! اس وقت تو گانا سننے کو دل چاہ رہا ہے۔ جلدی سے کوئی پھڑکتی ہوئی غزل سنا ڈالو'' ناہید باجی بڑے خوش گوار موڈ میں تھی۔

''مگر باجی....''

''یہ اگر مگر بالکل غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ پھر تم میری ضدی فطرت سے بخوبی واقف ہو۔ میں ہر بات منوانے کی عادی ہوں۔''

''لیکن باجی...! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں موسیقی سے بالکل نا آشنا ہوں۔''

''مریم! مجھے چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ تم اکثر اپنے کمرے میں گنگناتی رہتی ہو، میں نے خود تمھارے گنگنانے کی آوازیں سنی ہیں۔''

''اچھا باجی! یونہی سہی'' اور پھر میں ترنم سے غزل سنانے لگی۔

میری زندگی ہے ظالم تیرے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

''ارے یہاں تو تان سین کی ٹانگ توڑی جا رہی ہے۔''

یہ ایک مردانہ آواز تھی۔ میں نے گھبرا کر گانا بند کر دیا اور گھوم کر دیکھا تو ایک اجنبی نوجوان سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس دروازے میں کھڑا تھا۔ میں سخت بدحواسی کے عالم میں جلدی سے باجی کی اوٹ میں ہوگئی۔

''ارے حسن! تم کیوں شتر بے مہار کی مانند منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ یہاں پردہ ہے۔'' باجی نے حسن کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔

''مجھ کو غیب کا علم تھوڑا ہی تھا کہ یہاں پردہ ہے یا نہیں؟'' اس نے جواب دیا اور باجی کے قریب آ کر آہستہ سے بولا۔

''یہ کون ذات شریف ہیں؟'' باجی نے میرا تعارف کرایا۔ حسن بولے۔

''اوہو! پھر تو ایک رشتہ سے یہ ہماری بھتیجی ہوئیں۔ ارے اتنے بوڑھے چچا سے پردہ کیسا؟'' حسن میرے سامنے آ کر بے تکلفی سے بولے۔

''حسن! انسانیت کے جامہ میں آؤ'' باجی غصیلی آواز میں بولیں۔

''تو گویا آپ ابھی تک مجھے حیوان ہی سمجھ رہی ہیں۔ یہ بھی خوب رہی۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''ہاں تو بھتیجی صاحبہ! بے تکلف ہو کر بیٹھیے اور یہ اطمینان رکھیں میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا۔ کیوں کہ عرصے سے میں نے آدم خوری چھوڑ دی ہے۔'' میں ان کی باتوں پر مسکرا پڑی اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی میرے مقابل براجمان ہوگئے۔

''اسلام آباد میں پردہ، گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر قدامت پسند لوگ بھی ترقی یافتہ اور آزاد خیال بن جاتے ہیں۔ پھر اتنے بوڑھے اور پھونس چچا سے پردہ کرنا نہایت ہی خراب حرکت ہے۔'' حسن واقعی بڑے بوڑھے لہجے میں مخاطب تھے۔

یہ دیکھنے کے لیے بوڑھے ہیں یا جوان، میری نظریں ایک سیکنڈ کو ان کی جانب اٹھیں اور جھک گئیں۔ انھوں نے نچلے لب کو منہ کے اندر کر کے اور چہرے کے نقوش کو یوں بگاڑ لیا تھا جیسے وہ واقعی عمر رسیدہ ہوں۔ یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔

''ہاں غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھیں۔ میں نے تقریباً دو سو برس کی عمر پائی ہے۔ یہ جو آپ کو چہرے پر جوانی کے آثار نظر آ رہے ہیں...نا...''

''حسن! بند کرواپنی یہ لن ترانیاں۔'' باجی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا انھیں واقعی حسن کی باتوں سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

''مریم! آپ برا نہ مانیں۔'' یہ اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کا عادی ہے۔''

حسن منہ بنا کر بولے اور تو مجھ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"دراصل باجی! مجھے خاموشی سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ جوں ہی میں کسی کو خاموش دیکھتا ہوں تو نامعلوم کیوں میری یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے دل میں گھس کر اتنی گدگدی کروں کہ وہ مینڈک کی مانند پھدکنے لگے۔"

"اچھا بھئی! وہ اپنی ادھوری غزل تو پوری کردیں۔" وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

میں جواب دیے بغیر آتش دان میں بجھتی ہوئی چنگاریوں کو دیکھنے لگی، حسن کے بار بار اصرار کرنے پر بھی جب میں چپ رہی تو وہ طنزیہ انداز سے بولے۔ "نخرے کر رہی ہیں بے چاری! جیسے سچ مچ تان سین کی جانشین ہیں۔ اگر آپ نہیں گائیں گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

"گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ تان سین کے گانا نہ سنانے کی وجہ سے ہے۔" میں نے پہلی بار لب کشائی کی۔ وہ بھی ان کی طرف بغیر دیکھے۔

"شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔" وہ زیر لب مسکرائے۔

اس دوران میں ملازم کافی کی ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا۔

باجی نے کہا۔

"اب کون اٹھ کر پیالیوں میں کوفی انڈیلے۔ مریم تم ہی یہ فرائض سرانجام دو۔" وہ بڑے مزے سے آرام کرسی پر آدھی لیٹی ہوئی تھیں۔

میں نے پیالیاں سیدھی کرکے کوفی بنانی شروع کی۔ ایک پیالی بنا کر میں نے باجی کی جانب بڑھائی۔ تو حسن جھٹ باجی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولے۔

"اب کون لبوں تک پیالی لے جانے کی زحمت کرے۔ آپ ہی اتنا کرم کریں کہ یہی کوفی لیٹی ہوئی باجی کے منھ میں انڈیل دیں۔"

"باجی پر اتنی مہربانی کیوں ہو رہی ہے؟" باجی بولیں اور مجھ سے پیالی لے کر بیٹھ گئیں۔ میں نے حسن کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

"ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔" انھوں نے خالی پیالی میری جانب کرتے

ہوئے کہا۔

میں مسکرا کر ان کے لیے کوفی بنانے لگی۔

"کتنے چمچے چینی ڈالوں؟" میں نے پہلی بار ان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

"اُف ظالم... مار ڈالا۔" حسن میری نگاہوں میں نگاہیں ڈالے بول اٹھے۔

مجھے خجالت سے پسینہ سا آگیا۔

"کیا ہوا کس نے مار ڈالا؟" باجی جلدی سے پیالی میز پر رکھ کر پوچھنے لگیں۔

"بڑی دیر سے ایک کم بخت کھٹمل تنگ کر رہا ہے۔" حسن متانت سے بولے اور میرا چہرہ بحال ہوگیا۔

"دیکھیے میری پیالی میں صرف چھ چمچے شکر کے ڈالیں۔"

"اسی لیے تو آپ کو کھٹمل تنگ کرتے ہیں۔" میں نے پیالی ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کاش! یہ ہوشربا آن... میرا مطلب ہے کھٹمل اسی طرح تڑپاتے اور جلاتے رہیں تو زندگی کتنی پُرکیف گزرے۔" انھوں نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں یاد رہے ساتھ ساتھ کونین کے کڑوے گھونٹ بھی نوش کرنے پڑیں گے۔" میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

آتش دان میں انگارے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اُف! آخر کار انسان کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں افسردہ سی ہوگئی۔

"مس مریم غوری صاحبہ!" حسن بولے۔

میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

انھوں نے خالی پیالی میری طرف بڑھائی اور مسمریزم کے انداز میں میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولے، "ایک اور پیائے کی چالی۔ (چائے کی پیالی)"

میں اور باجی بے ساختہ ہنس پڑیں اور لطف یہ کہ حسن حیرت سے ہماری ہنسی کا جواز ڈھونڈ رہے تھے۔ جب ان کی توجہ غلطی کی جانب دلائی گئی تو اپنی خجالت مٹانے کی خاطر پھیکی

پھیکی ہنسی ہنسنے لگے۔

"حسن! کیا اس بار کرسمس یوں ہی ڈل سا گزر جائے گا؟" باجی بولیں۔

"میرے خیال میں تو اس بار پارسال سے بھی کہیں زیادہ پُرکیف و پُربہار ہے۔"

حسن کن انکھیوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"خاک پُرلطف ہے" باجی بے زاری سے بولیں، "نہ تو اب تک پکنک منانے کا پروگرام بنا ہے نہ ہی کوئی پکچر دیکھی اور نہ ہی کوئی مستی کوئی ہنگامہ ہوا۔"

حسن نے کہا "تو پھر کیوں نہ ہم مری پکنک منانے چلے جائیں۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کا بھی نظارہ کرلیں گے۔"

"خیال تو برا نہیں مگر موسم سرما پہاڑی علاقوں کی نسبت کھلے میدانوں میں زیادہ دل کش ہوتا ہے۔ مری کی کسی اونچی چوٹی سے اگر کوئی پھسل گیا تو دیکھ وہ نیچے گہرائی میں گرتا ہی چلا جائے گا۔" میں نے حسن کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے سنجیدہ شرارت سے کہا۔ باجی ہنس پڑیں۔ وہ کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔ دوسری پیالی بناتے وقت میں نے ان کی آنکھ بچا کر چینی کی بجائے دو چمچے نمک کے ڈال دیئے۔ ایک گھونٹ بھرتے ہی وہ واش روم کی جانب لپکے۔ باجی کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

"باجی! یہ لڑکی اب مجھ سے پٹے گی۔ اتنے بوڑھے بزرگ چاچو سے ایسا بھونڈا مذاق۔" وہ منہ بسورتے ہوئے واش روم سے واپس لوٹے۔

"بہرحال مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہورہی ہے کہ شکست نہ کھانے والی ہستی پے در پے یورشوں کی تاب نہ لاکر اب پسپا ہورہی ہے۔" باجی ہنسی کے مارے دوہری ہوئی جارہی تھیں۔

"دشمن بھی تو بڑا گھاگ ہے عجیب وغریب ہتھکنڈوں سے مسلح ہوکر ہم پر حملہ آور ہورہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے حسن نے ایک ترچھی نظر مجھ پر ڈالی اور مسکرانے لگے۔

☆

میرے رہنے کے لیے مجھے جو کمرہ دیا گیا تھا اس کے سامنے خوب صورت پھولوں

کا پلاٹ تھا۔ میں اکثر سامنے کی کھڑکی کھول کر ان کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ پھولوں اور پودوں کی میں شروع سے ہی عاشق تھی۔ میں کلیوں کی معصوم زندگی کو دیکھ کر نئی اور اَن جانی وادیوں میں جا گھستی تھی۔ پھولوں کی تازگی و شگفتگی میری شخصیت پر اثرانداز ہونے لگی اور اب میرا من بھی مسکرانے کو چاہتا تھا۔ بھیا کے خطوط باقاعدگی سے آرہے تھے اور ان میں میری دل بستگی کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا۔

ناہید باجی کو پارٹیاں دینے اور دعوتیں اڑانے کا بہت شوق تھا۔ ان کی دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا لہٰذا ہر روز اگر لنچ یا ڈنر پارٹی نہیں تو ٹی پارٹی ضرور ہوا کرتی تھی۔ بسا اوقات میں ان ہنگاموں سے اکتا جاتی تھی۔ ان پارٹیوں کو اٹینڈ کرنے کے لیے باجی میرے لیے ڈھیروں ملبوسات خرید لاتیں اور ان کے ساتھ ساتھ میچ کرتے ہوئے جوتے اور جیولری بھی لے آتیں اور میں منع کرتی رہ جاتی۔ میں کافی حد تک شرم سار سی ہوتی تھی۔ میں جب بھی منع کرتی وہ یہ کہہ کر میرا منہ بند کردیتیں۔

"مریم! اپنوں سے بیگانوں جیسی بات مت کیا کرو۔"

ایک دن پکنک منانے کا پروگرام طے ہوا۔ لیکن میرا دل پکنک پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف باجی کی خفگی کو بھی اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے طوعاً وکرہاً میں بھی تیار ہوگئی۔

وہ صبح بہت لطافت آمیز اور درخشاں تھی۔ مینہ برس کر تھم چکا تھا۔ بدلیاں دھیرے دھیرے غائب ہوگئیں اور ماحول تتلیوں سے بھر گیا۔ پہاڑوں سے جھرنے پھوٹ پڑے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پرندے باغوں میں چہکنے لگے۔ گلوں کی مسحورکن خوش بوؤں نے چمن کو معطر کردیا۔ گلاب کی بندکلیاں کن انکھیوں سے عاشق مزاج بھونروں کو تاک رہی تھیں۔ چمن میں سوسن کھلکھلا رہے تھے۔ چنبیلی کی کنواری کلیاں مسکرا مسکرا کر پھول بن رہی تھیں۔ ہار سنگھار کی خمیدہ سبز ٹہنی پر گلدم بیٹھی اپنی سریلی آواز میں نغمے بکھیر رہی تھی۔ شگوفے، خوش گوار ہوائیں اور شفاف دھلا دھلا نیلگوں آسمان دھنک کے رنگ بکھیر رہا تھا۔ دور افق میں مری کی بلند چوٹیاں کالی گھٹا کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

ہائے کیسی عجیب تھی وہ رومانوی صبح اور اس کی افسانوی فضا۔ میں اور باجی اس ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

باجی کی خالہ زاد بہن نجمی آپی چہرے پر عجیب سی شرارت لیے اور مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی آئیں۔

اسے دیکھتے ہی باجی جلدی جلدی ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگیں۔

''آنکھوں میں شہتیر پڑ گیا ہے جو بار بار مل رہی ہو؟'' نجمی آپی نے پوچھا۔

''تمھارے آنے کا اعتبار نہیں آ رہا اس لیے آنکھوں کو مل مل کر خود کو یقین دلا رہی ہوں کہ کہیں یہ کوئی سپنا تو نہیں ہے؟''

''خیر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جاگتے وقت بھی سہانے خواب دیکھنے کی تمھاری پرانی عادت ہے۔'' نجمی آپی مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''سچ کہتی ہوں آج تمھیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی بھولا بھٹکا مسافر کہیں سے آ نکلا ہو۔'' ناہید باجی نے کہا۔

نجمی آپی مسکرا کر بولیں ''راستہ بھول کر بھی میں صحیح منزل پر پہنچی ہوں آنے کو تو دل کئی دن سے کر رہا تھا مگر یہ خواہش اس لیے پوری نہ ہو سکی کہ تم پر تازہ تازہ صدمہ گزرا ہے۔ خواہ مخواہ میرا دل بھی پریشان ہوتا۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے المیہ واقعات و حادثات سے میری کیا حالت ہو جاتی ہے۔''

نجمی آپی کی بات سنتے ہی فوراً میں نے ناہید سے پوچھا۔

''باجی! آپ کو کس بات سے صدمہ پہنچا ہے اور اب تک مجھ سے کیوں چھپائے رکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نجمی کی بات پر دھیان مت دینا۔ یہ تو بات کا بتنگڑ بنانے کی ماہر ہے۔'' ناہید باجی نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''اچھا ناہید! ذرا خدا لگتی کہنا کیا تمھیں جمیل سے منگنی ٹوٹنے کا صدمہ نہیں ہوا؟'' نجمی آپی مسکرا کر بولیں۔

''بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس غم سے میرا شیشۂ دل چور چور ہو چکا ہے۔'' باجی خوش دلی سے بولی۔

مجھے ان کی گفتگو سے الجھن سی ہو رہی تھی اور افسوس ہو رہا تھا کہ باجی نے مجھ سے بے تکلف ہونے کے باوجود مجھے اپنا رازدان نہیں بنایا تھا۔ میرے چہرے پر حیرت اور تعجب کے آثار دیکھ کر نجمی آپی بولیں۔

''میرا خیال تھا کہ آپ سب کچھ جانتی ہوں گی۔ ناہید آپ کو تمام احوال سنا چکی ہو گی مگر ناہید تو بہت زیادہ گہری نکلی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سر ہی کیوں نہ اُتر جائے لیکن یہ اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کرے گی۔ اصل میں جمیل صاحب دُور کے رشتہ میں ناہید کے کچھ بھائی وائی سے لگتے ہیں۔ اور بچپن ہی سے ان سے منسوب تھے۔ ان کی جامع تعریف تو یہ ہے کہ سوٹ بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ اور دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ محض تکلف کر رہے ہیں۔ اگر سوٹ زیب تن نہ کریں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور رات کو اس لیے عینک لگا کر سوتے ہیں تا کہ خواب دھندلے نظر نہ آئیں۔ کبھی کبھار سوٹ کے ساتھ اس خیال سے سو جاتے ہیں کہ عین ممکن ہے خواب میں کوئی شریف آدمی ملنے آ جائے تو سلیپنگ سوٹ میں دیکھ کر ان کے متعلق بدذوقی کا فتویٰ صادر نہ کر دے۔ اور خیر سے جناب شاعر بھی ہیں۔ ہماری بنّو ناہید باجی کی مدح میں قصیدے بھی کہتے رہے ہیں۔''

نجمی آپی نہایت سنجیدہ لیکن شرارتی انداز میں یہ قصہ سنا رہی تھیں۔ ادھر ہم دونوں ہنسی سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔

نجمی آپی مزید کہنے لگیں۔

''اب ذرا جمیل صاحب کی کنجوسی کا قصہ بھی سن لیں۔ کنجوسی تو گویا جمیل پر ختم ہے سینما جانے کا بڑا شوق ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی خاطر عموماً کسی نہ کسی دوست کو پھانسنے کے لیے ہتھکنڈے اور ڈائیلاگ استعمال کرتے ہیں۔

''ارے یار آج فلاں فلم نہ دیکھی جائے؟ اس کی بہت تعریف سنی ہے... اماں یار! تم بھی عجیب کودن ہو۔ میرے ہوتے ہوئے پیسوں کی فکر کیوں کرتے ہو تمھارا اور اپنا ٹکٹ

میں اپنی جیب سے خریدوں گا اور ہاں پکچر کے ساتھ ساتھ کیک، پیسٹری، سموسے اور چائے کا دُور بھی چلے گا۔تم بھی کیا یاد رکھوگے کہ کسی رئیس سے واسطہ پڑا تھا۔'' وہ دوست کی نظروں کے سامنے اپنا منی بیگ گھماتے ہوئے اسی طرح کے ڈائیلاگ بولتے رہتے تھے۔

ایک دن شامت اعمال سے کمال اور حسن اس کے نرغے میں پھنس گئے اور ان دونوں جمیل کو بڑے ٹھاٹھ سے کار میں بٹھا کر سینما ہال پہنچے۔انھیں کار میں چھوڑ کر خود بھیڑ بھاڑ کو چیرتے ہوئے ٹکٹ خریدنے چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد منہ بسورتے اور آنسو بہاتے واپس آگئے اور کہنے لگے۔

''یار غضب ہوگیا۔میرے کوٹ کی جیب کسی گرہ کٹ نے کاٹ لی ہے۔ میں تو آج لٹ گیا ایک روپیہ تک نہیں چھوڑا اس کم بخت نے۔'' انھوں نے اپنی تراشی ہوئی جیب دکھائی۔اس نقصان پر حسن اور کمال بھائی نے ان سے بڑی ہمدردی کی اور افسوس کا اظہار بھی کیا اور اپنے روپوں سے اس کا بھی ٹکٹ خریدلیا اور اس پر طرہ یہ کہ واپسی پر جمیل کی کار میں پٹرول بھی ڈلوانا پڑا۔لیکن جلد ہی ان کی اصلیت کا پردہ فاش ہوگیا۔انکشاف یہ ہوا کہ وہ گھر سے ہی پھٹی ہوئی جیب والا کوٹ پہن کر جایا کرتے تھے۔''

نجمی آپی خوب نمک مرچ لگا کر یہ قصہ بیان کر رہی تھیں۔

اس پر میں نے کہا۔

''نجمی آپی! آپ تو ابھی کہہ رہی تھیں جمیل بیوقوف ہے مگر یہ واقعہ سننے کے بعد تو یقین ہوتا ہے کہ وہ بہت سے عقل مندوں پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔حالاں کہ ایسے مواقع پر تو بعض اوقات ذہین لوگ بھی مات کھا جاتے ہیں۔''

''یہی تو میں ناہید کو ایک عرصہ سے سمجھا رہی ہوں کہ اس سے شادی کر کے بی بی عیش کروگی عیش۔اپنی مرضی سے جمیل کے کان پکڑ کر لیفٹ رائٹ کرواسکوگی مگر یہ تو خواہ مخواہ کمال بھائی کے لیے برنگ مری جا رہی۔۔۔''

''نجمی! میں اکثر سوچتی ہوں کہ تمھاری زبان کس قدر چلتی ہے کہ کہیں رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

اس پر نجمی آپی نے کہا۔

''ارے ہاں میں تمھاری بذلہ سنجیوں کو خوب سمجھتی ہوں۔اتنے عرصہ تک تم کو سمجھا ہے۔تم نے اڑائیں اور ہم نے بھون بھون کھائیں...''

''کیا مکھیاں؟'' باجی پھر بول اٹھیں۔

''ہمیں چٹکیوں میں مت اڑاؤ جی۔اچھا بندی تو چلی۔''

نجمی آپی قدرے جھنجلا کر بولیں اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

''اری شریر بیٹھو بھی۔''

تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

باجی نے انھیں پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔''ابھی تھوڑی دیر تک ہم لوگ پکنک منانے جائیں گے۔''

''مجھے مت روکو ناہید! بے چارے کمال بھائی کل کار کے حادثے میں بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔کسی مریض کو دیکھنے جا رہے تھے کہ خود ہی مریض بن گئے۔'' آپی چہرے پر بڑے ہی افسردگی پیدا کر کے غم ناک لہجے میں بولیں۔

''اُف! کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔'' باجی کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

''زیادہ تو نہیں، البتہ دونوں خوب صورت ٹانگیں فی الحال ناکارہ ہوگئی ہیں بیساکھی کا سہارا لینا پڑے گا۔''

ان کے دل کی دگرگوں حالت کا اندازہ ان کے چہرے سے ہو رہا تھا، وہ غم کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔

''اُف خدایا! مجھے کیوں نہ خبر کی، کیا میں غیر تھی؟'' باجی نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا لی اور ان کی پلکوں پر آب دار موتی جھلملا رہے تھے۔

''ارے، بھئی! کمال بھائی کی حالت اتنی مخدوش تھی کہ کسی کو اطلاع دینے کا ہوش ہی نہ رہا۔'' آپی دکھ بھرے لہجے سے بولیں۔

''کیا واقعی ان کی دونوں ٹانگیں ضائع ہوگئی ہیں۔'' یہ تو بہت ہی دردناک واقعہ

ہے۔ میں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''اُف... کمال۔'' باجی نے نڈھال ہوکر کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکادیا۔ رُکے ہوئے آبدار موتی ان کی پلکوں سے چھلک پڑے۔

آپی زیرِلب مسکراہٹ سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔ معاً میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں آپی نے یہ مذاق تو نہیں کیا۔ میں نے ابھی سوچا ہی تھا کہ اسی اثنا میں حسن اور کمال بھائی آگئے۔

''اُف! کمال تمھیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔ تمھاری دونوں ٹانگیں محفوظ تو ہیں نا؟''

باجی نے کمال کو دیکھتے ہی ایک دم بوکھلاتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میری ٹانگیں تو بفضلِ خدا بالکل ٹھیک ہیں۔ کیوں کیا ہوا میری ٹانگوں کو؟''

کمال بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

نجمی آپی دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا کر زور زور سے ہنس رہی تھیں۔

اب ناہید باجی نے چیں بجبیں ہوکر اس کی جانب دیکھا تو اس نے بڑے مزے سے زبان نکالتے ہوئے منھ دوسری طرف کرلیا۔

''اب فرمایئے میری زبان کے متعلق۔ دیکھا اس زبان کا کرشمہ جس راز کو آپ مدتوں سے سینے میں چھپائے چھپائے پھر رہی تھیں اسی راز کو کس حکمتِ عملی سے آپ کی زبانِ مبارک سے اگلوا ڈالا۔ وہ بھی سب کے سامنے۔ میری حاضر دماغی کی داد دیجیے صاحب! میرے کندھے تھپ تھپایئے۔'' نجمی آپی، باجی کی جانب شرارت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ناہید باجی، آپی کو مارنے دوڑیں۔

اچانک حسن بولے۔

''ارے... یہاں تو پانی پت کا میدان بنا ہوا ہے۔ اس جنگ کو کل تک کے لیے ملتوی کیجیے۔'' اور پھر حسن نے جلدی سے باجی اور آپی کے سر کو زور سے ایک دوسرے کے ساتھ بھڑا دیا۔

''اُف سر بھنا کر رہ گیا۔'' آپی اور باجی اپنا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس وقت میں خود کو ایسا خاموش تماشائی محسوس کر رہی تھی جس سے کسی کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کو محسوس کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں مجھے کیوں جلن اور کسک سی ہونے لگی تھی۔

اچانک کمال بھائی مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔

''مریم صاحبہ! میں جب بھی آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ سنگ مرمر کا ایسا مجسمہ ہیں جسے خداوند تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں تو عنایت کردیے ہیں مگر قوتِ گویائی سے محروم رکھا ہے۔''

''کمال! ایسا نہ کہو۔ چچا غالب نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یہ حسن کی آواز تھی اور اس کی اس بات پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کیا میرا وجود صرف لوگوں کی ہنسی کا ہدف بنا رہے گا؟ میری آنکھوں کے کٹورے چھلکنے کو تھے۔

''حسن!'' باجی کی بھنویں غصے سے سکڑ گئیں۔ باجی ہمیشہ ایسے موقع پر میری ڈھال بن جایا کرتی تھیں۔

''باجی! میری پیاری باجی!'' حسن نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ تو یوں ہی خفا ہونے لگیں۔ وہ... میں نے کہا باجی! پکنک کے پروگرام کا کیا ہوا؟''

وہ بڑی خوب صورتی سے باجی کی خفگی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''پروگرام تو وہی ہے جو رات کو طے ہوا تھا بس ابھی ہم تھوڑی دیر میں تیار ہوجائیں گی۔'' باجی بولیں۔

''اُف! عورتوں کی تیاری کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں۔ بڑے سے بڑا مجاہد بھی اپنی مکمل وردی ان سے کم وقت میں پہن لیتا ہوگا جتنا وقت یہ عورتیں معمولی قمیص شلوار وغیرہ زیبِ تن کرنے میں صرف کرتی ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ہم نے تمام تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔

کار تک گیرج سے باہر نکال لائے ہیں اور آپ نے ابھی تک اپنے لیے کوئی لباس ہی منتخب نہیں کیا۔''

''بنت حوا بڑی کاہل الوجود واقع ہوئی ہیں عمل تو کچھ ہوتا نہیں بس خیالی پلاؤ پکانا کوئی ان سے سیکھے۔'' کمال بھائی مسکرا کر بولے۔

''جی نہیں، ہم نے تیاری تو آپ سے پہلے ہی کرلی تھی۔ مگر شیطان کی خالہ نے آ کر بلاوجہ ہمارا دماغ چاٹنا شروع کردیا۔'' ناہید باجی کا اشارہ نجمی آپی کی طرف تھا۔

''ہاں ہاں واقعی اور مزے کی بات یہ بھی ہے کہ نجمی آپی کی زبان کی رفتار کسی جیٹ جہاز سے کم نہیں ہے۔ ایک منٹ بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں ہیں۔'' حسن بولے۔

''جی ہاں بجا فرما رہے ہیں آپ۔'' باجی منہ بنا کر بولیں۔

''یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کمال بھائی کی خاطر مجھے کتنی چالیں چلنی پڑی ہیں۔''

باجی نے اسے گھور کر دیکھا۔ آپی بھلا کب مرعوب ہونے والی تھیں۔ لہٰذا وہ دوبارہ بولیں۔ ''بڑی مشکل سے شطرنج کی بازی جیتی ہے۔'' وہ دزدیدہ نظر سے باجی کو دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں دنیا بھر کی شرارت سمائی ہوئی تھی۔

''اب بھئی! کمال بھائی سے کراچی کا سوہن حلوہ کھائیں گے۔'' باجی کے تیور کڑے ہوگئے۔ کمال بھائی زیر لب مسکرا رہے تھے۔ ناہید باجی کے چہرے پر شرم سے جو شفق سی پھیل گئی تھی غالباً اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خوشی سے باجی کی آنکھوں میں قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔

☆

ہماری کار چھوٹی سی سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ سڑک کے اردگرد کھلے میدان میں ہرے بھرے شاداب لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ آنکھوں کو بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دریائے جہلم سے ابھی ایک میل ادھر ہی تھے کہ حسن اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے بولے۔

''کمال! ذرا کار روکو ہم یہاں تیتر کا شکار کریں گے۔''

''احمق ہیں آپ بھی۔ ہم پکنک منانے آئے ہیں یا شکار کھیلنے۔'' کمال نے کار کو

دھیما کردیا۔

''اور آپ تو ہیں ہی چغد، یہ نہیں سوچتے کہ آخر یہ بندوق کس مقصد کے لیے لایا ہوں۔ دراصل پکنک منانے کا تو ایک بہانہ تھا۔''

''اچھا بھئی! ووٹوں سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ دیکھنا تمھاری ہی سبکی ہوگی۔'' حسن مسکرا کر بولے۔

''ہم سب متفقہ طور پر حسن بھائی کی حمایت کرتی ہیں۔'' باجی نے سب کی نمائندگی کی۔

''اف! حسن تو بلا مقابلہ ہی منتخب ہوگیا ہے۔'' کمال نے کہا اور سڑک کے ایک طرف کار کھڑی کردی۔ ان کے پاس دو بندوقیں تھیں۔ ایک کمال نے سنبھال لی۔

کھیتوں میں حسن نے کرتب دکھائے انھوں نے ایک کوّے پر فائر کیا وہ مرا تو نہیں درختوں کی شاخوں سے ٹکراتا ہوا نیچے گیا۔ اس کا پر کٹ گیا تھا۔ اس کے بعد اس سے اُڑا تو نہ گیا البتہ وہ زمین پر ہی پھدکنے لگا۔ انھوں نے بہت چاہا کہ اسے ماریں۔ مگر دو تین فائروں پر بھی وہ ان کے نشانہ کی زد میں نہ آیا۔

''بس کریں حسن بھائی! مرے کو مارے شاہ مدار بننے کی کوشش نہ کریں۔'' آپی بولیں۔

حسن نے مسکرا کر بندوق نیچے رکھ دی اور اپنے آپ کو گھاس پر یوں گرا دیا جیسے بہت ہی تھکے ماندے ہوں۔ سرسوں کے ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت پیلے رنگ کا دوشالہ اوڑھے کسی ابٹن لگی دلھن کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ گل آفتاب کے زرد کھیت سینے میں داغ سجائے جھوم رہے تھے۔ دہقان کھیتوں میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ یہ علاقہ دادا ہمایوں کا تھا۔

میں نے خاموشی سے حسن کی بندوق اٹھالی۔

''بندوق پکڑنا تو آتا نہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو شکار کھیلنے کا شوق کیوں چراتا ہے۔''

حسن کہنی کا سہارا لے کر اور ہتھیلی پر سر ٹیک کر بولے۔

''مریم صاحبہ! اگر بار خاطر نہ گزرے تو مابدولت بندوق چلانا سکھا دیں۔'' حسن کی نگاہوں میں میٹھی میٹھی کشش تھی۔

"جی شکریہ! پہلا درس تو آپ کوّا مار کر ابھی دے چکے ہیں۔" میں نے بندوق میں کارتوس بھرتے ہوئے کہا۔ "اب مزید آپ سے کیا سبق لوں گی۔" یہ کہا اور اُڑتے ہوئے کوّے کو نشانہ بنایا۔ کمال بھائی جھٹ بول اٹھے۔

"حسن! چاقو تیار رکھنا بہت بڑا نشانہ باز شکار کرنے لگا ہے۔"

میں نے ان کی پروا کیے بغیر کوّے پر فائر کر دیا۔ کوّا قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گرا اور چند لمحے تک رقص بسمل کے بعد دم توڑ دیا۔

میں نے فاتحانہ انداز میں ان سب کی طرف دیکھا جو مجھ پر آوازیں کس رہے تھے۔

"ارے! تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں۔" نجمی آپی بولیں اور باجی نے خوشی سے مغلوب ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

"فائر کرنا تو محض بہانہ تھا۔ دراصل کوّا تو ان کی نظروں کے تیر سے گھائل ہوا ہے۔"

حسن کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

اس پر سب ہنس پڑے اور میں کٹ کر رہ گئی۔

کمال اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میرے خیال میں تو ہر خاتون کو رائفل چلانے کی تربیت ضرور حاصل کرنی چاہیے اس سے شجاعت جیسا اعلیٰ جوہر پیدا ہوتا ہے۔"

"جی ہاں! تقسیمِ ہند نے عورتوں کی آنکھیں کھول دی ہیں کیوں کہ اس وقت مرد حضرات حفاظت کے سلسلے میں نااہل ثابت ہوئے تھے اور اپنی بہنوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے اور وہ مظلوم خواتین وہاں غیر قوم کی بربریت اور ظلم و ستم کا ماتم کرتے ہوئے خون کے آنسو بہاتی رہیں۔ وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھیں؟" کاش میں مرد ہوتا تو ضرور اپنی بے گناہ اور بے بس بہنوں کو ہندوؤں کے چنگل سے چھڑا کر لاتا۔" میرے اس مردانہ لہجہ پر سب کو ہنسی آ گئی۔

"جی ہاں! ناصح بننا آسان کام ہے۔ مگر عمل کرنا بڑا کٹھن ہے۔" حسن نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اگر میں کسی بات کا عزم کر لوں تو اس پر عمل کرنے کا

جذبہ بھی بدرجہ اتم مجھ میں موجود ہے۔" میں نے ذرا تیکھے انداز میں جواب دیا۔

حسن میری جانب مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کی تپش سے میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا اور سامنے پھیلے ہوئے سبزہ کو دیکھنے لگی جہاں زندگی پھوٹ پھوٹ کر برستی نظر آ رہی تھی اس اثنا میں کمال بھائی کو ایک گھنی اور خاردار جھاڑی میں خرگوش کا شک ہوا۔ لہٰذا انھوں نے جھاڑی کو ایک دم جھنجھوڑا تو خرگوش گھبرا کر نہایت تیزی سے باہر نکل بھاگا۔ اس کا رخ نجمی آپی کی جانب تھا جو کھڑے کھڑے بڑے بڑے مزے سے گاجریں کھا رہی تھیں۔ میں ان کو خبردار کرنے ہی والی تھی کہ آناً فاناً خرگوش ان کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل گیا اور آپی بوکھلا کر چاروں شانے چت ہو گئیں۔ یہ سب کچھ ایک دو لمحوں میں ہو گیا۔ ہم نے آگے بڑھ کر انھیں اٹھایا۔ وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئیں اور پھر ہماری ہنسی میں ان کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

"بھئی! اب شکار کو تو اٹھا کر رکھیے ایک طرف۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو پکنک کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔" کمال بھائی نے کار کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے کتنا لطف آ رہا ہے ان کھیتوں کو دیکھ کر یہ کمال بھی بڑے بدذوق ہیں۔ آخر ڈاکٹر جو ٹھہرے۔" آپی منہ بسور کر بولیں۔

"یہ تو خرگوش تھا اس لیے آپ بچ گئیں لیکن اگر کوئی شیر آ گیا تو پھر آپ کیا کریں گی۔"

"آپ کے پیچھے کھڑی ہو جاؤں گی۔ اتنا تو حق ہے نا آپ پر۔" آپی نے بڑے پیار بھرے انداز میں جواب دیا۔

میں نے گل آفتاب توڑ کر ان کے گچھے سے بنا کر پنوں سے بالوں میں اٹکا لیے۔

"کیوں دوسروں کو بے موت مارنے کا سامان کر رہی ہیں۔" حسن آہستہ سے یہ جملہ کہتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔

یہ سن کر میرے گال شرم سے تمتما اٹھے تھے۔

کار دریا کی جانب چل پڑی دریا کے کنارے مختصر سا بازار تھا۔ چند دکانیں تھیں ان

میں سے کسی ایک پر گراموفون پر ایک گھسا ہوا ریکارڈ بج رہا تھا۔ سڑک کے ایک طرف ہندوؤں کا ٹوٹا پھوٹا مندر تھا۔ جس کو ایک دیوہیکل اور عمر رسیدہ پیپل نے ڈھک رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دریا کا بہت بڑا بند تھا اور دریا کے پار خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ تھا اور ان جھاڑیوں کے پیچھے مچھیروں کی بستی تھی۔ دریا کے کنارے چند کشتیاں کھڑی تھیں جن میں سے چند میں کچھ وزرا کی تصاویر آویزاں تھیں اور کچھ کشتیوں میں پرانی ایکٹرسوں کی مختلف پوز میں تصاویر لٹک رہی تھیں کشتیوں کے اوپر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ملاحوں سے اجرت طے کر کے ہم نے دو کشتیاں لیں۔ آپی میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کشتی میں کود پڑیں۔

''حسن بھائی! آپ بھی ادھر آجائیں۔ حسن مسکراتے ہوئے چپو سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''کمال بھائی! آپ کیوں کھڑے ہیں ہمارے پیچھے آجایئے!'' آپی مسکرا کر بولیں۔ وہ دونوں ابھی کنارے پر ہی تھے کہ ہماری کشتی بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

''یہ ادبی اور شاعرانہ مزاج کے لوگ بڑے بدذوق ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کہیں پکنک کے لیے جائیں یا کوئی پکچر دیکھنے، یہ لوگ ہر جگہ ہاتھ میں کتاب یا رسالہ ضرور رکھتے ہیں۔''

آپی نے ان کی گود میں پڑے رسالہ ''ماہ نو'' کو چھین لیا۔

''کیا یہ مصنف بھی ہیں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! حسن تو بڑے مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے میں ان کی نگارشات کو انہماک سے پڑھا جاتا ہے۔''

''ماہ نو، تو عموماً میرے مطالعہ میں بھی رہتا ہے لیکن ان کا نام تو آج تک میری نظر سے نہیں گزرا'' میں نے کہا۔

اس پر آپی نے جواب دیا ''یہ دیکھو'' یہ کہہ کر رسالہ کھولا سامنے صفحہ پر ایک مضمون کا عنوان ''عورت'' چمک رہا تھا اور اوپر ایک کونے میں مصنف کا نام تابش لکھا تھا۔

''اوہو! تابش کے مضامین کی تو میں بے حد مداح ہوں۔ ٹھوس اور حقیقت پر مبنی مضامین اور افسانے پڑھ کر میں یہی خیال کرتی تھی کہ ان کو تخلیق کرنے والا کوئی عمر رسیدہ اور تجربہ کار ہوگا مگر آپ تو اس کے برعکس نکلے۔'' میں نے بڑی عقیدت سے اپنے جذبات کا

اظہار کیا۔

''آپ کا حسنِ ظن ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔'' حسن بڑی دلچسپی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ان کی شگفتہ نگاہوں میں شوخ قسم کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ میں نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''ایک آپ پر ہی منحصر نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کو میرے بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں بعض لڑکیوں نے تو مجھے اپنی ہم جنس سمجھ کر میرے ساتھ قلمی دوستی بھی کر رکھی ہے۔''

''اوہو! معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔''

آپی بولیں۔ ''حسن! اب تم یوں کرو کسی وقت ان لڑکیوں سے ہماری ملاقات کرادو۔ اگر ان میں کوئی اچھی سی لڑکی ہوئی تو تمھارے لیے منتخب لی جائے گی۔''

''ہم... تو (دزدیدہ نگاہ مجھ پر ڈال کر) اِن لڑکیوں سے بھی زیادہ موزوں اور قابلِ قدر ہستی کا انتخاب کر چکے ہیں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ ان کے حضور میں ابھی تک ہماری پزیرائی تو دُور کی بات ہے تاحال ان تک رسائی بھی نہیں ہو سکی۔''

آپی نے شوخ وشریر نظریں مجھ پر ڈالیں گویا وہ حسن کی باتوں کی گہرائی تک پہنچ گئی تھیں اور پھر مسکرانے لگیں اور میرا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔

حسن نے کشتی کو بادبان کے بھروسے پر چھوڑ دیا اور خود سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر فضا میں چھوڑنے لگے۔ میں خاموشی سے ہاتھ لٹکائے پانی سے کھیلنے لگی۔ کشتی اپنے بہاؤ پر چل رہی تھی۔ کشتی کے چلنے سے دریا میں ایک ہلکا سا تلاطم پیدا ہو رہا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ تلاطم تو میرے دل میں تھا۔

''ارے... ارے... رے وہ دیکھئے نیگیٹو جارہا ہے۔'' حسن نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز سے میری توجہ سامنے کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک سیاہ فام حبشی کی جانب مبذول کرائی۔

''غالباً آپ کی تصویر کا کھویا ہوا نیگیٹو ہے۔ ورنہ آپ اس طرح گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرتے۔'' میں نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"تم بھی کبھی کبھی اچھا مذاق کر لیتی ہو۔

آپی بولیں۔ "حسن اب کشتی کو واپس موڑ لو" حسن نے فوراً کشتی کو واپس موڑ لیا۔

ہم لوگ جلد ہی ساحل پر پہنچ گئے۔ ناہید باجی اور کمال بھائی کار کے قریب کھڑے تھے۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے" کمال بھائی ہمیں دیکھتے ہی بولے۔

بھئی کمال! تم اپنے نام کی مناسبت سے واقعی کمال کرتے ہو۔ آخر یہ کیا حرکت تھی کہ دریا کی سیر کیے بغیر کنارے ہی سے لوٹ آئے۔" حسن نے کہا۔

"بھئی! ہمیں تو ناہید کی خوشی مقصود ہے۔ اسے پانی سے ڈر آتا ہے۔"

"جی ہاں! ایسے ہی تو آپ میرے پچا..." وہ بچاری کہتے کہتے رک گئیں اور کھسیانی سی ہو کر جلدی سے کار میں جا گھسیں۔

"ناہید کی ایسی ہی حرکتوں پر مجھے ہنسی آتی ہے۔" کمال بولے۔

"ہنسنا تو اچھی بات ہے شکر کیجیے رونے کی نوبت نہیں آتی۔" باجی قدرے خفگی سے بولیں۔

"آپ کو اگر زیادہ بھوک لگی ہے تو کوئی پھل کھا لیں، غصہ کھانا کچھ اچھی عادت نہیں ہے اس سے پیٹ میں گرانی ہو جاتی ہے۔" کمال بھائی متانت سے بولے اور باجی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

چند میل کے فاصلے پر ان کا گاؤں "ہمایوں فارم" کے نام سے تھا۔ یہ گاؤں دادا ہمایوں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے ایک بڑے اور خوب صورت سے باغ میں ان کی کاٹیج تھی۔ نوکروں نے کھانے کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔ سب نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانا مزے دار تھا، خوب لطف آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسن اور کمال بھائی تو تاش لے کر بیٹھ گئے ناہید باجی اور نجمی آپی کیرم سے دل بہلانے لگیں۔ مجھے چوں کہ ان چیزوں سے دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا میں باغ کی خوب صورت روشوں پر چہل قدمی کرتی ہوئی کافی دور نکل آئی۔ قدرت کے کمالات کے ساتھ ساتھ ملازمین نے بھی باغ کو بنانے سنوارنے میں بہت محنت کی تھی۔ باغ میں دامنِ دل کش مناظر تھے۔ جابجا روشیں، سرسبز گھاس اور پھولوں

سے سجی ہوئی کیاریاں، شگوفوں کی چٹک اور پُر کیف بہار کا شباب۔ غرضے کہ قدرت کی یہ صناعی دیکھ کر دل بے اختیار حمد و ثنا کرتے لگتا ہے۔

میں ندی کنارے سنگ مرمر کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ ندی کا پانی آہستہ روی سے بہہ رہا تھا۔ موجوں کے دھیمے دھیمے ساز پر ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ ایسی خوب صورت جگہ پر ہر چیز ہی بہت زیادہ حسین نظر آ رہی تھی لیکن میرے لیے یہ سب کچھ نہ جانے کیوں کچھ زیادہ باعثِ کشش نہ تھا، میں "ماہ نو" کی ورق گردانی کرنے لگی اور اس میں تابش کا مضمون غور و خوض سے پڑھنے لگی۔

"عورت قوتِ برداشت کا پیکر اور ایثار و وفا کی پتلی ہے، وہ مرد کی غلام نہیں بلکہ اس کی زندگی کے دُکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ مرد، عورت دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں ایک پہیہ اگر نکل جائے تو گاڑی چل نہیں سکتی... میرے نزدیک عورت حسن و انسانیت کا ایسا مرقع ہے جس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ عورت کا دل بہت ہی نازک ہوتا ہے اس کی دل آزاری کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد عورت کی اس سے زیادہ عظمت اور بڑائی بیان نہیں کی جا سکتی۔ عورت دنیا میں ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ ایک ایسی تخلیق کار ہے جس کی کوکھ سے بڑے بڑے پیغمبر، لیڈر، ڈاکٹر، سائنس دان پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی عزت و تکریم ہمارا اوّلین فرض ہے۔"

واہ، کس قدر پاکیزہ طرزِ تحریر ہے اور حسن کتنے بلند خیالات کے مالک ہیں۔ میں نے سوچا۔ اچانک پانی میں ایک عکس سا لرزا میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا تو حسن کھڑے تھے۔

"ارے! آپ یہاں بھی۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں؟ میری موجودگی کچھ ناگوار گزر رہی ہے اگر آپ کہیں تو واپس چلا جاؤں۔"

حسن دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔

"آپ بے تکلف ہو کر تشریف رکھیے۔" میں نے مری ہوئی آواز سے گھاس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "بھلا آپ کی موجودگی مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگی؟" کہنے کو تو

میں نے کہہ دیا لیکن دراصل میں اس وقت تنہائی چاہتی تھی۔

حسن گھاس پر بے تکلفی سے ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئے اور میں بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان بے تکی سی خاموشی تھی۔ سرد ہوا کے فرحت بخش اور معطر جھونکے میرے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ میں کنارے سے گھاس نوچ نوچ کر ندی میں پھینکنے لگی جو بھنور میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔

''چمکیلی دھوپ، ٹھنڈی ہوا، معطر فضا، ٹہنیوں اور پتوں کی سرگوشیاں اور مزید لطف یہ کہ نیلے نیلے فلک پر سفید بادلوں کے گالے۔ یہ سب کچھ مل کر کتنا حسین منظر پیش کر رہے ہیں۔ قدرت کی اس کارگری اور صناعی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔'' حسن نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں اچھا موسم ہے۔ مگر اتنا جاذب نظر بھی نہیں ہے کہ...'' میں رُوکھائی سے جواب دے رہی تھی کہ میری بات کاٹ کر حسن بولے۔

''اُف! آپ کے اس سرد جواب سے تو برف کے تودے سے لڑھکنے لگے ہیں۔''

حسن میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

حسن آنکھوں کے راستے میرے دل میں اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں گھبرا کر آم کے پیڑ کی طرف دیکھنے لگی جہاں سیکڑوں چڑیاں بیٹھ کر پُرسکون فضا میں شور برپا کر رہی تھیں۔

''آپ کے دل پسند مشغلے کیا ہیں؟'' حسن کی آواز میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔

''محبوب مشغلہ تو کوئی نہیں۔'' میں نے چڑیوں پر بدستور نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''ہاں البتہ کائنات کی ہر چیز کو حقائق کی نظر سے دیکھنے کی عادی ہوں۔''

''شاعری، افسانہ نویسی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔''

''فضول سی چیزیں ہیں۔ تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔'' ایک بار پھر میرے اس روکھے سے جواب پر حسن نے یوں منہ بنایا جیسے کڑوا بادام منہ میں آ گیا ہو اور پھر وہ منہ کو لٹکا کر بیٹھ گئے۔ وہ بھی سوچتے ہوں گے کس بدذوق سے پالا پڑا ہے؟ ان کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور میں مسکرانے لگی۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر ان کی ہمت بندھی اور بولے۔

''خیر مذاق برطرف۔ آپ اپنی دل بستگی کا کچھ تو سامان مہیا کرتی ہوں گی۔''

''کیوں نہیں!'' آخر میں بھی ایک انسان ہوں میرے پاس بھی ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جس میں آرزوئیں، تمنائیں پرورش پا کر دم توڑ دیتی ہیں۔ آج کل پھر از سرِنو ایک آرزو بڑی شدت سے انگڑائی لے رہی ہے اور میری آنکھوں میں ایک نئی صبح بیدار ہو رہی ہے۔'' میں نہ جانے کیا کیا اور کن تاثرات کے تحت بولے جا رہی تھی۔

''کون ہے آپ کی آرزوؤں کا مرکز؟'' حسن نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''موت...!'' میں جلدی سے گفتگو کا موضوع پلٹ گئی۔ ''بعض اوقات موت مجھے ایسی شریف، دل فریب اور پیاری معلوم ہوتی ہے کہ کبھی زندگی میں بھی ایسی دل کشی معلوم نہیں ہوتی۔'' میری آواز بھرا گئی اور حسن کا چہرہ بجھ سا گیا۔

میرے یہ خیالات جاننے کے بعد وہ کہنے لگے۔

''آپ بڑی زود رنج اور یاسیت زدہ ہیں۔ مانا کہ زندگی میں قدم قدم پر تفکرات ہیں رنج و الم ہیں، ناکامیاں ہی ناکامیاں ہیں مگر ان سے انسان کو مایوس تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے ہنسی ہی تو دکھوں کا مداوا ہے۔ زندگی تو مہکتے اور خوش آئند مستقبل کا پیام ہے۔

''حسن صاحب! یہ سب ان لوگوں کے لیے ہیں جن کو ہر طرح کی خوشیاں اور مسرتیں میسر ہوتی ہیں اور جو بے چارے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے زندگی بھر ترستے رہتے۔ ہوں وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے دُکھی لہجے میں کہا۔ زندگی ایک خواب پریشان ہے اور بس۔ دنیا ایک سرائے فانی ہے... یہاں شکست آرزو اور مجروح جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ جذبات کا ہجوم بے اختیار مجھے کہاں سے کہاں کھینچ کر لے گیا ہے۔ میری اس کور ذوقی کو معاف کر دیں۔ خواہ مخواہ آپ کی سمع خراشی کر رہی ہوں۔'' میں نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔

میری یہ تقریر دل پذیر سن کر حسن کہنے لگے۔

''غالباً کبھی آپ نے خیال نہیں کیا۔ آپ کی یہی باتیں تو مجھے لطف دیتی ہیں۔ کاش! آپ کو معلوم ہوتا آپ کے ایسے ہی نیک اور اچھے جذبات و خیالات آپ کا حسن اور

صبیح و ملیح چہرہ اور آپ کی یہ سحر انگیز آنکھیں میرے لیے کس قدر دامنِ دل کش ہیں۔" وہ مدہوشی کے سے عالم میں بول رہے تھے۔

"اونہہ! آپ بڑے یا وہ گو ہوتے جا رہے ہیں۔" میں نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا، "اب میں آپ سے قطعی نہ بولوں گی۔"

"اچھا صاحب! نہ بولیے میں کب التجا کر رہا ہوں۔" انھوں نے اپنے لہجے کو حتیٰ الامکان سنجیدہ بنا کر کہا۔

اب پھر ہمارے درمیان ایک تلخ خاموشی کی خلیج حائل ہو گئی۔ انھوں نے پہلے سیٹی بجائی پھر سگریٹ سلگایا اور مجھ پر نظریں ڈالتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ نجمی بھی بڑی عجیب چیز ہیں کل پارٹی میں نہ جانے آپ کے متعلق کیا کیا افواہیں پھیلا رہی تھیں۔ میرا تو سن کر خون کھولنے لگا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ کہہ رہی تھیں... کہ..." ان کی نظریں دور جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ "خیر اب جانے دیں بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ آپ نے خود ہی تو اس سے دل کی بات کہی ہو گی۔ اسی لیے تو وہ سب میں نشر کر رہی تھیں۔"

"خدارا اس تمہید کو چھوڑ کر بس آ جایئے مطلب پر۔" میں بے صبری سے بولی۔

"آپ نے تو نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے نا؟" وہ شرارت سے مسکرائے۔

میں شرمندہ سی ہو گئی۔ "آپ بڑے ش...

"بڑے شریف ہیں۔ یہی کہنا چاہتی تھیں نا آپ۔" وہ میری بات کو درمیان ہی سے لے اڑے ایک لمبا سا کش لے کر دھواں میرے ماتھے پر پھینک دیا۔

"ہٹیے بھی! آپ تو مذاق کرنے لگے ہیں۔" میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔

"چھوڑیے بھی! مجھ میں کہاں اتنی اہلیت کہ مذاق کر سکوں۔" انھوں نے بھرپور کش لے کر میرے منہ پر دوبارہ دھواں چھوڑ دیا۔ میں تلملا اٹھی۔

"اونہہ! آپ شیطا..."

"بھئی دیکھیے! آپ کے بار بار شیطان کہنے سے تو واقعی ہم کو اپنی ذات پر شک سا ہو چلا ہے کہ کہیں سچ مچ ہم ابلیس تو نہیں ہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔

اس اثنا میں نجمی آپی آ گئیں۔

"آپ لوگ بھی خوب ہیں۔ ادھر نہ تو بھیا اور ناہید کا پتا چلتا ہے اور نہ ہی آپ دونوں کا۔ تنہائی میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ خدا بھلا کرے باغبان کا، جس نے آپ لوگوں کا پتا بتایا ہے۔ ورنہ مارے دہشت کے میرا تو ہارٹ فیل ہو جاتا۔" آپی منہ بنا بنا کر اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کر رہی تھیں۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"آپ دونوں میں کس موضوع پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔" نجمی آپی نے پوچھا۔

"میں کہتا ہوں کہ سامنے آم کے پیڑ پر جھولا ڈالا جائے تو چاندنی رات میں جھولا جھولتے ہوئے بڑا لطف آئے گا۔ مگر مریم صاحبہ کو اس سے اختلاف ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ جھولا مالٹے کے پودے میں زیادہ موزوں رہے گا۔"

"آپ غلط بیانی سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ میں نے تو گلاب کے پیڑ کے لیے کہا تھا۔" میں نے خشک سا منہ بنا کر کہا۔

"او گڈ! بعض اوقات مریم بھی بے ساختہ بڑے مزے کی بات کہہ دیتی ہیں۔" آپی مسکرا کر بولیں۔ ان کا اشارہ شاید "گلاب کے پیڑ" کی طرف تھا۔

حسن کی اداس نظریں دور خلاؤں میں الجھی ہوئی تھیں۔ آپی نے گلاب کا پھول توڑا اور تاک کر ان کی ناک پر دے مارا۔ پھول ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ وہ ایک دم چونک پڑے اور جھنجھلا کر آپی کی جانب دیکھا۔

"جناب والا! کہاں اور کون سے جہان میں تھے۔ کہیں افیون کی پینک تو نہیں آ گئی۔" آپی نے پوچھا۔ حسن نے خاموشی سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں۔

"اوہو، اب سمجھی۔" آپی آنکھوں کو گول گول گھماتے ہوئے بولیں۔ "کچھ ناچاقی سی محسوس ہو رہی ہے اگر آپ کہیں تو دونوں میں صلح کرا دوں، جوڑ توڑ کرنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"آپی یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ نے کٹنیوں کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔" میں مسکرا کر بولی۔

"صلح تو تب کی جاتی ہے جب لڑائی ہوئی ہو لیکن یہاں تو کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ پوچھ لیجیے ان سے۔"

"حسن بھائی! آپ کس بات پر منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ اگر مریم نے کچھ کہا ہے تو اس کی گوشمالی کروں گی۔"

"نہیں نجمی آپی! انھیں کچھ نہ کہنا ورنہ میرے دل پر چوٹ لگے گی۔" حسن جھٹ بول اٹھے۔

"اوہو! معلوم ہوتا ہے کہ کیوپڈ کا تیر کام کر گیا ہے۔"

آپی نے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں بلا وجہ ہی شرما گئی۔

"تو کیا حسن مجھ سے محبت... نہیں... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ امیر اور غریب کا سنجوگ ہو ہی نہیں سکتا۔ ریت کا ذرّہ ستاروں کی طرح کیسے چمک سکتا ہے، ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

میرے دل اور دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور جسم پر ہلکی ہلکی کپکپاہٹ ہونے لگی۔

واپسی کا سفر مزے میں کٹا۔ آپی کی چھیڑ چھاڑ اور حسن اور کمال بھائی کا لہک لہک کر اپنی بھاری بھرکم آواز میں غزل گنگنانا ہم سب کے لیے اچھی خاصی تفریح تھی۔

سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ پرندے ہوا کے سمندر میں غوطہ زن تھے اور فضائے بسیط میں نغمے بکھیرتے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ آپی اور کمال بھائی کو ان کے گھر چھوڑ کر ہماری کار ہمایوں لاج میں پہنچی تو پورچ میں دادا ہمایوں کو اپنا منتظر پایا، سب نے انھیں سلام کیا۔

"باجی! بھوک سے پیٹ میں چوہے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ لٰہذا گرم گرم سموسوں

اور پکوڑوں کا ناشتا تیار کروا دیں۔" حسن کار سے اترتے ہی بولے۔

"دھن بھاگ ہیں حسن تمھارے۔" باجی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔ "سچ کہتی ہوں ابا حضور! حسن تمام راستے چرتا آیا ہے۔ اور میرا خیال تھا کہ یہ گھر پہنچتے ہی چورن کا مطالبہ کرے گا لیکن یہ تو سچ مچ بڑا پیٹو ہو گیا ہے۔"

"میں آپ کی طرح چیونٹی تھوڑی ہوں جو سونگھ کر جیتی ہے۔"

"کہو بیٹی! گاؤں کو کیسا پایا؟" دادا حضور مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"بڑا ہی دل کش۔ دیہات کی زمین بڑی شاداب اور ہے۔ جھیل، آبشار کھلی فضا، سرسبز باغ اور حسین نظاروں کے علاوہ وہاں کی فضا میں بھی جادوئی اثر اور نغمگی ہے۔ میں تو وہاں اپنی زندگی کے تمام دُکھ درد بھول گئی تھی۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں! بجا ارشاد فرما رہی ہیں۔" حسن جھٹ بولے۔ "یقین کریں ابا حضور! یہ تو وہاں سارا وقت منہ بسورے بیزار بیزار سی رہی ہیں۔"

"خیر تم تو ازل سے ہی دروغ گو ہو، گپو کہیں کے۔" دادا حضور بولے۔

میں اور باجی ہنس پڑیں۔ حسن منہ چڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆

صبح ہونے کو ہے مرغ سحر کی آواز گونج رہی ہے۔ فضائیں اس نغمۂ صبح گاہی سے لبریز ہیں۔ میری بے خواب آنکھوں میں خمار سا بھرا ہوا ہے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ بھیا کے خط نے گہرے تاثرات و احساسات کا ہیجان دل میں پیدا کر دیا ہے اور اللہ جانتا ہے کہ میں رات بھر مدہوشی اور سرشاری کی کیفیت میں رہی۔ رات بہ مشکل گزری ہے۔ دل و دماغ میں بے خودی اور بے چینی ہے۔ میٹھی میٹھی سی کسک محسوس ہو رہی ہے۔

بھیا کے خط سے پیش تر حسن میرے خیالوں اور سپنوں سے کوسوں دُور تھے! لیکن اب تو وہ بن بلائے مہمان کی مانند میری دنیا میں چلے آئے اور دبے پاؤں دل میں براجمان ہو گئے۔ یوں تو میں انھیں ہر روز ہی دیکھا کرتی مگر بھیا کے خط نے تو ان کو میری نظروں میں ایک قابلِ قدر ہستی بنا دیا ہے۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ میں نے حالتِ

اضطراری میں تکیے کے نیچے سے بھیا کا خط دوبارہ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

میری عزیز بہن!

دوپہر بارہ بجے کے قریب آوارہ گردی، سیر گلگشت، صحرانوردی (جو جی چاہے آپ کا کہہ لیجیے) سے واپس لوٹا، پوسٹ آفس پہنچا تو وہاں آپ کے اور دادا حضور کے خطوط میرے منتظر تھے۔ آوارہ گردی اور صحرانوردی اس لیے کہا کہ طبیعت کا حال بقول جگر یہ ہے:

سوئے صحرا نکل چلے وحشی
انتظارِ بہار کون کرے

ہاں آپ کی جدائی سے طبیعت اکثر مکدّر رہو جاتی ہے۔ مگر اس خیال سے یہ پریشانی ختم ہو جاتی ہے کہ مشکل کا یہ وقت خدا کے فضل و کرم سے جلد کٹ ہی جائے گا بے شک آپ کو ایک غیر گھر میں رہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہوگی۔ مگر جن کو آپ غیر سمجھتی ہیں وہ تو اب اپنے ہونا چاہتے ہیں۔

دادا جان باقاعدہ حسن کا پیغام تمھارے لیے دے چکے ہیں۔ عزیز بہن! میری بھی دلی خواہش ہے کہ تمھیں اپنے ہاتھوں سے حسن کی دلھن بناؤں۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ میں تمھاری سگائی کے سلسلے میں چند دنوں کی چھٹی لے کر بروز اتوار بذریعہ ہوائی جہاز تمھارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ باقی ملنے پر۔

والسلام۔ دعاگو

تمھارا بھائی

یوسف

بھیا کا خط میرے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا کیوں کہ ایک لرزش سی میرے وجود پر طاری تھی اور میں محسوس کر رہی تھی کہ آج دنیا میں مجھ سے زیادہ مسرور و دل شاد میرے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ میں آپ ہی آپ بے اختیار مسکرا رہی تھی۔ خوشیاں اور مسرتیں میرے قدم چوم رہی تھیں۔ دریچے سے گلاب اور چنبیلی کے پودوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ بہار عروج پر تھی۔ چمن میں ہر طرف خوب صورت پھول جھوم جھوم کر اپنے وجود کا احساس دلا رہے تھے۔

نکہتیں ہر سُو فضا کو معطر کر رہی تھیں۔ طائرانِ خوش نوا، چہچہا رہے تھے۔ نسیمِ سحر کا فرحت بخش جھونکا آیا اور اپنے دامن سے کمرے میں خوش بوئیں جھٹک گیا۔ میں نے اپنے چہرے پر تازگی اور نور کا لمس محسوس کیا۔

اس روز کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی میں دریچے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہوا کی گنگناہٹ کہہ رہی تھی کہ آج بھیا آ رہے ہیں۔ بلبلوں کی چہچہاہٹ میں بھی بھیا کی آمد کی خبر تھی۔ میں بہت خوش تھی۔ میرا انگ انگ مسرتوں سے پھوٹ رہا تھا۔

''اوہو! آج مریم کا چہرہ اور آنکھیں تو گویا خوشیوں اور کیف انگیز نکہتوں سے مخمور ہیں۔'' ناہید باجی میرے قریب آ کر بولیں۔

''ناہید باجی میں خوش کیوں نہ ہوں آج میرے بھائی یوسف آ رہے ہیں۔ اسی خوشی سے میں دیوانی سی ہو رہی ہوں۔'' میں نے اتنا کہہ کر بھیا کا خط باجی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''اچھا! تو یہ بات ہے'' باجی خط پڑھنے کے بعد ایک خوش گوار مسکراہٹ سے بولیں۔ ''اسی لیے تو تمھارے ہونٹوں پر تبسم ہے۔'' باجی نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ ڈالا۔

''اُف! تمام ہڈیاں پسلیاں چرمرا کر رکھ دیں۔'' میں نے جھینپ کر بڑے پیار سے انھیں پرے دھکیل دیا۔

صبح بہت روشن اور چمکیلی تھی۔ بہت سے خیالات دل و دماغ میں موجزن تھے۔ سامنے مری کی دل کش پہاڑیاں سرسبز و شاداب درختوں سے لدی پھندی کھڑی تھیں۔ سکون بخش ماحول پر ہر سُو مسرتوں نے ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔ میں بھیا کی آمد کی خوشی سے سرشار تھی۔ لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خوشیوں کے یہ لمحات عارضی ہوں گے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ چند ساعت بعد میری خوشیوں سے بھری پُرسکون زیست میں کوئی ایسا بھونچال بھی آنے والا ہے جو میرے وجود کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا، مسرتیں روٹھ جائیں گی اور میرے گرد غموں اور دکھوں کا حصار کھینچ جائے گا۔ لب مسکرانا بھول جائیں گے۔

خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ کمال بھائی اور حسن کار لے کر

ایئرپورٹ جا چکے تھے۔ انھیں آنے میں دیر ہو رہی تھی اور میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار دور سے بیوک کار آتی ہوئی نظر آئی تو میرے شوریدہ دل میں امیدوں کے دیے جل اٹھے۔ کار ایک دردناک ''چیں آں'' کر کے پورچ میں کھڑی ہوگئی۔

میں والہانہ انداز سے کار کی طرف دوڑی۔ حسن اور کمال بھائی خاموشی سے کار سے باہر آئے۔

''کیا بھیا نہیں آئے؟'' میں نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میرا دل مضطرب ہو رہا تھا۔

حسن کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ انھوں نے اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور مردہ سے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

''مریم بہن! کیا واقعی یوسف بھائی نے اسی ہوائی جہاز سے آنے کو لکھا تھا۔'' کمال میرے چہرے پر نظریں جمائے بولے۔

''ہاں ہاں! آپ پریشان کس لیے ہیں؟'' میں گھبراہٹ سے بولی۔

''اُف!'' انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔ ''خدا کرے وہ اس پلین میں نہ ہوں۔''

لخت میرا دل ڈوبنے سا لگا۔

''کیا ہوا اس جہاز کو آپ بولتے کیوں نہیں؟'' باجی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

اور پھر میرے کان صرف اتنا سن سکے کہ کوئٹہ ایئرپورٹ سے ہوائی جہاز اڑتے ہی الم ناک حادثہ کا شکار ہوگیا۔

مجھے یوں لگا جیسے دنیا میں قیامت آگئی ہو۔ طوفان تو میرے ساتھ ساتھ چل ہی رہے تھے۔ لیکن اب تو مجھ پر قیامت گزر گئی۔

☆

میں بھائی کی موت کا صدمہ حوصلے اور صبر سے سہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دادا حضور کو دیکھ کر صبر و برداشت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔

دادا حضور مجھے بہت حوصلہ دیتے اور ہمت بندھاتے اور مجھ سے انتہائی شفقت و محبت سے باتیں کرتے تھے۔ ان کی باتوں اور محبت و شفقت سے مجھ میں جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا اور میں دُکھ، درد اور مایوسی کے حصار سے نکل آتی تھی۔

خوشیاں بانٹنے والا محبت کرنے والا میرا مونس و غم گسار اور میرا عزیز ترین بھائی جو میرا واحد سہارا تھا، مجھ سے روٹھ گیا اور میں اس وسیع دنیا میں تنہا...رہ گئی تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ اب میں کیوں اور کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟

☆

باجی مریم اپنی طویل داستان رنج و غم سناتے سناتے یہاں پہنچ کر خاموش ہوگئیں۔

ان کی بے نور آنکھیں اشکوں کی آگ میں جل رہی تھی لیکن ان کے لبوں پر ایک ملکوتی تبسّم پھیلا ہوا تھا۔ ان کا فسانۂ درد و غم سن کر میرا دل بھی حسرت و یاس کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

باجی مریم طویل ٹھنڈا سانس لے کر دوبارہ کہنے لگیں۔

''وہ کتنی حسین اور رنگین شام تھی قوس قزح کی وجہ سے آسمان بہت خوب صورت نظر آ رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان پر کسی نے گوٹا کناری پھیلا دی ہے۔ ہمایوں لاج ایوانِ زریں بنا ہوا تھا۔ روشوں پر جابجا جلتے بجھتے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ہر طرف مسرت و شادمانی رقص کر رہی تھی۔ گھر میں مہمانوں کے شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ برات آچکی تھی۔ میں اور باجی کمرے میں دلہنیں بنی بیٹھی تھیں۔ ہمارے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں لرزتے آنسو تھے جن کو پلکوں کی جھالریں چھپائے ہوئے تھیں۔ ہم اس وقت خوشی اور غم کی کیفیات میں مبتلا تھیں۔ مہمان لڑکیاں ہمارے اردگرد جمع تھیں۔

''مریم! تمھارا دولھا بڑا شریر اور نٹ کھٹ ہے۔'' نجمی آپی مسکراتی ہوئی بولیں۔

''جس وقت قاضی صاحب، حسن بھائی سے ایجاب و قبول کروانے لگے تو جھٹ بولے۔ ''قبلہ قاضی صاحب! اگر منظور نہ ہوتا تو آپ کو یہاں آنے کی زحمت گوارہ نہ کرنی پڑتی۔''

''واقعی! حسن بھائی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ انھیں دیکھنے کو دل بہت چاہ رہا ہے۔'' ریحانہ خوش دلی سے بولی۔

"تو بھئی! یہ کون سا مشکل کام ہے سامنے والی کھڑکی کھولیں۔ اس کے سامنے ہی مردانہ ہے۔" تسنیم نے کہا۔

سب بھرا مار کر کھڑکی کے گرد جمع ہوگئیں۔ کھڑکی پر چلمن پڑی ہوئی تھی۔ باراتی چائے پینے میں مصروف تھے۔ سامنے ہی کمال بھائی سر پر سہرا لپیٹے بیٹھے تھے اور حسن بھی گولڈن شیروانی زیب تن کیے سر پر سہرا لپیٹے بہن کی بارات کی خاطر مدارت میں پیش پیش تھے۔ وہ مجھے اتنے حسین اور پیارے لگے کہ میری نظریں ان کی جانب ہی مرکوز ہوکر رہ گئیں اور زندگی میں پہلی بار محبت آگیں نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"بھئی! ناہید اور مریم ابھی سے ایسی ندیدی نظروں سے اپنے اپنے دولھا کو مت دیکھو۔ دیکھنے کے لیے تمام عمر پڑی ہے۔" نجمی آپی بولیں۔ سب ہنس پڑیں۔

"میں تو تمھارے کیم شحیم منگیتر کو دیکھ رہی ہوں۔" میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

"کون سے ہیں نجمی آپی کے ہونے والے دولھا؟" ریحانہ نے پوچھا۔

"جو اکلوتی آنکھ والے ہوں وہی تصور کرلیں" ناہید باجی نے کہا۔ "ہاں بھئی! تم دونوں نے (میں اور باجی) ہمارے خاندان کے بہترین لڑکے چُن لیے ہیں اسی لیے تو اِترا کر مجھ پر پھبتیاں کس رہی ہو۔" آپی مصنوعی خفگی سے کہا۔

"نجمی! کیا وہی تو تمھارے منگیتر نہیں جو دولھا کو کھانے کی چیزیں پیش کر رہے ہیں۔" ازراہِ شرارت ایک آنکھ والے بیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"خدا نہ کرے" آپی جھٹ بولیں۔

"وہ رہے دولھا کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھے صاحب بہادر۔ بے ڈھنگا سا ہے تمھارا منگیتر۔" باجی شرارت سے اس کا حلیہ بتانے لگیں۔ لمبی سی "ناک ہے اور بے تحاشا لمبا چوڑا ماتھا، رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئیں، پچکے ہوئے گال، پتلی سوکھی گردن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ڈھانچے پر کسی نے کھال منڈھ دی ہے۔"

"بھئی، ایسے موقع پر ہمیشہ ماشاء اللہ کہنا چاہیے کہیں نظر نہ لگ جائے میرے مجنوں

کو۔" آپی بھی شرارت میں شریک ہوگئیں۔

"سنا ہے ان کے سر پر بال بھی نہیں ہیں نجمی! یہ واقعی حقیقت ہے یا لوگوں کی شرارت ہے" ریحانہ نے پوچھا۔

"گنجے ونجے تو نہیں ہیں۔" نجمی آپی نہایت سنجیدگی سے بولیں" البتہ بچپن میں سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں اور دادی اماں نے ان کا سر منڈوا دیا تھا۔ جب سے اب تک چندیا چٹیل میدان بنی ہوئی ہے۔"

"آپی! باتیں بھی ایسی کرتی ہیں کہ گدھوں کو بھی ہنسی آجائے۔" میں نے کہا۔

"گدھوں کو ہنستے ہوئے آج تک کسی نے نہیں دیکھا البتہ وہ ڈھیچوں ڈھیچوں کا راگ ضرور الاپتے ہیں اور جنابہ اسی راگ کو ہنسی سے تعبیر کر رہی ہیں۔ شوہر تو بڑا گرگ باراں دیدہ ملا ہے لیکن تمھاری معصومیت ایسی ہے اس پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔"

میں اور باجی دلہنوں کی مانند پھر سمٹ کر بیٹھ گئیں کیوں کہ سب مہمان عورتیں ہمارے کمرے میں جمع ہوگئی تھیں۔ رسومات کے بعد بابل کا گھر چھوڑنے کا وقت آیا اور باجی وداع ہوکر اپنی سسرال سدھاریں۔ میں اپنے آپ کو پتھر دل سمجھتی تھی لیکن اب میرے آنسو کسی طور بھی تھم نہیں ہو رہے تھے۔ میں بھی اکثر لڑکیوں کی طرح تصور میں دیکھا کرتی تھی کہ دلھن بن کر بڑی مسرت اور چاؤ سے اپنے باپ کے گھر کو چھوڑ کر پیا کے گھر چلی جاؤں گی۔ مگر آہ! وہ سارا جذباتی ارتعاش وقت کے ریلے میں بہہ گیا اور اب یہ سب دُکھ بھری رسومات دکھائی دے رہی تھیں۔ باپ کا گھر کہاں تھا؟ بھائی کے شفقت بھرے ہاتھ میرے سر پر کہاں تھے؟ ماں کی الوداعی دعائیں کدھر گئیں؟ میں سوچتی سوچتی رونے لگی تھی۔

آپی دوبارہ بڑی محنت سے میرا میک اپ کر رہی تھیں اور مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ آنسو تمھاری آنکھوں کے اَن مول موتی ہیں ان کو یوں رائیگاں نہ کرو اور پھر تمھاری حسین آنکھوں میں آنسو اچھے بھی تو نہیں لگتے یہ حسین آنکھیں تو صرف مسکرانے کے لیے ہیں۔ میری پیاری بھابی! سب لڑکیوں پر یہی وقت آتا ہے۔ اس میں رونے کی بھلا کیا بات ہے؟"

"سب لڑکیاں روتی بھی تو ہیں۔" میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

اچھا اس لیے رو رہی ہو تو پھر کوئی بات نہیں۔ من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں۔" آپی نے شرارت سے کہا۔ روتے روتے میری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

☆

حسن کے ساتھ میری شادی کیا ہوئی کہ میری تو زندگی کا انداز ہی بدل گیا۔ حسن کے قدم جہاں پڑتے تھے وہاں میری پلکیں بچھتی تھیں۔ میری زندگی کے اندھیرے اُجالوں میں تبدیل ہوگئے تھے اور یوں زندگی کے مسرت آگیں لمحے پُرسکون گزرنے لگے۔

ہمارا مختصر سا خاندان مطمئن تھا اور خوشیوں اور شادمانیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس خاندان کے سربراہ دادا ہمایوں تھے جو اب میرے سسر بھی تھے۔ ناہید باجی، کمال بھائی کے ساتھ پانچ سال کے لیے امریکا چلی گئیں۔ اگرچہ باجی کی جدائی مجھ پر شاق گزر رہی تھی لیکن پھر بھی میں مطمئن تھی کیوں کہ مجھ سے محبت کرنے والا میرے ناز اٹھانے والا شوہر اور باپ کی سی شفقت کرنے والے سسر بھی تھے۔ میں خوش تھی بہت خوش۔ میرے چہرے پر ہر وقت دل آویز مسکراہٹ رہتی اور میں شگفتہ کلیوں کی مانند کھلی کھلی رہتی۔ بعض اوقات مجھے اپنی قسمت پر رشک سا آنے لگتا۔ سب کا پیار پا کر میں بسا اوقات سہم جاتی مجھے خوف سا آنے لگتا کہ میرے اس گلشن کو کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ میں آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر چاروں طرف پھونکیں مارتی رہتی لیکن اس کے باوجود میں اندر کے ہولناک سناٹے سے نہ جانے کیوں خوف زدہ تھی۔

ایک سال کے بعد اللہ نے ہمیں بیٹا دیا۔ ہماری مسرتوں میں بہت اضافہ ہوگیا۔ میری اور حسن کی امیدوں کا مرکز اب ہمارا بیٹا تھا۔ اس کی ننھی منی کلکاریاں گھر کو خوشی کا گہوارہ بنا رہی تھیں۔ خوشی کے یہ لمحات بڑی تیزی سے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ ننھے کی توتلی باتیں ہمیں بہت محظوظ کرتی تھیں۔ حسن اکثر تجارت کے سلسلے میں لاہور اور کراچی کے چکر کاٹا کرتے تھے انھوں نے اپنا ہیڈ آفس لاہور ہی میں بنا رکھا تھا۔ جب بھی وہ لاہور سے واپس لوٹتے میرے لیے تحائف سے لدے پھندے آتے۔ دادا جان کو دل کا عارضہ تھا۔ باجی انھیں

بار بار فون کر کے امریکا آنے کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں اور پھر آخر کار ایک روز دادا ہمایوں علاج کے لیے واشنگٹن چلے گئے۔

ایک دن جب بہت ہی خوش گوار دوپہر تھی، حسن کراچی سے واپس لوٹے۔ میں جلدی سے ان کے لیے چائے لے آئی۔ ننھے کے سامنے کھلونوں کا انبار لگا ہوا تھا وہ پاؤں پسارے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ حسن نے جھک کر سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے چیزیں باہر نکالنے لگے۔ میں نے چائے کی ٹرے کو تپائی پر رکھ دی۔

"حسن کی جانم کے لیے حسن کا حقیر سا تحفہ قبول فرمائیں۔" حسن نے میری جانب قیمتی ساڑھی بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ بہت خوب صورت اور قیمتی ساڑھی تھی اسے دیکھ کر میں خوشی سے پاگل سی ہوگئی۔

وہ مجھے پیار سے جانم کہتے تھے۔ کتنا حسین خطاب تھا حسن ساڑھی مجھے دے کر کہنے لگے۔ "تم جو بھی رنگ پہنو تمھارا حسین چہرہ اسی میں سج جاتا ہے۔"

"آپ کے اتنے سارے تحائف اور التفات وصول کر کے میرا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا ہے۔" میں نے محبت بھری نگاہیں ان پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میری تو دلی تمنا ہے کہ دنیا جہاں کی مسرتیں نچوڑ کر صرف تمھارے حسین چہرے پر نثار کرتا چلا جاؤں اور تمھاری ایک مسکراہٹ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر میرا بس چلے تو چاند، ستارے توڑ کر تمھارے قدموں میں بچھا دوں۔

حسن بڑے پیار اور محبت سے کہے جا رہے تھے اور میں بےخودسی ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ تمام خوشیاں سمٹ کر میرے چہرے پر آگئی ہیں اور میری آنکھوں سے محبت کی ضو پاشیاں نکل کر ان پر نثار ہو رہی ہیں مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔

حسن کی آنکھوں میں محبت کی لپک تھی۔ میں نے مخمور و مدہوش نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"جانم تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ تمھاری یہ خوب صورت آنکھیں کتنی حسین ہیں۔ جی چاہتا ہے ان میں ڈوب جاؤں۔ تم میری زندگی ہو تمھاری پلکیں اٹھتی ہیں تو میری دنیا روشن

ہوجاتی ہے۔''

مجھے تہمت نہ دو میں شرابی نہیں وہ نظر سے پلائے تو میں کیا کروں

حسن میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بولے جارہے تھے۔

''حسن! مجھے اتنا پیار نہ دو کہ میرے دل میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس پیدا ہوجائے اور غرور اللہ کو ہرگز پسند نہیں ہے۔''

''کتنا خوب صورت ہے میرا گلشن۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھ رہا ہوں کہ مجھے تمھارے جیسا ہم سفر ملا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا میرا مقدر ستاروں سے بھی آگے کہکشاؤں کی بلندیوں سے بھی بلند ہے۔

ننھا ٹمی جوتوں سمیت ان کی گود میں سوار ہوگیا اور میں ان کے لیے چائے بنانے لگی۔

''کیا اب بھی چھ چمچ چینی کے ڈالوں؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں اب تو تمھارے لبوں کی شیرینی ہی کافی ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولے۔

پھر چپکے سے ٹمی کے کان میں کچھ کہا۔ ''ڈیڈی اچھے اور ممی گندی گندی'' ٹمی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

''چل شریر کہیں کا۔ اب میں تمھیں پیار بھی نہ کروں گی۔'' میں نے مسکراہٹ سے کہا۔

''یہ تو ڈیڈی نے کہا ہے۔'' ننھا معصومیت سے بولا۔

میں اور حسن ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہنس پڑے ''خدا کی قسم جانم! یوں تو ہم روز چائے پیتے ہیں۔ مگر تمھارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کا جو لطف ہے وہ کہیں نہیں ملا۔ وہ پیالی رکھتے ہوئے بولے۔

میں اپنی قسمت پر بے حد نازاں اور فرحاں تھی۔ خدا آباد رکھے میرے اس گلشن کو اور کسی کی نظر نہ لگے۔ خوشیوں اور مسرتوں کے سمے تیزی سے بھاگتے چلے جارہے تھے میں حسن کو والہانہ انداز سے چاہنے لگی اس کا عشق میرے اندر بھڑکتا ہوا الاؤ بن گیا عشق عبادت

ہے عشق خدا کا روپ ہے کائنات کی بنیاد عشق سے تعبیر ہے۔

☆

خوشیوں اور مسرتوں بھرے دن تیزی سے گزرتے رہے۔ حسن کاروبار کے سلسلے میں لاہور واپس چلے گئے اور میں ایک بار پھر ان کی جدائی میں سلگنے لگی اور حسبِ سابق انھیں خطوط بھیجنا شروع کردیے لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس مرتبہ خلافِ توقع میرے کسی بھی خط کا جواب نہیں آرہا تھا اور اگر فون کرتی تو فون بھی نہ سنتے۔ میں بہت پریشان تھی میرے دل کی کلی جیسے مرجھا چکی تھی لیکن میں انھیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہی مگر جواب ندارد۔ نہ فون نہ خط، الٰہی کیا ماجرا ہے کئی ماہ گزر گئے اور میں جدائی کی صلیب پر ٹنگی رہی۔ آخرکار میں نے انھیں آخری بار خط لکھنے کا سوچ کر قلم اٹھایا اور خط لکھنا شروع کیا۔

میری آرزوؤں کے درخشاں آفتاب!

حرماں نصیب جانم کا سلام

جب سے تم گئے ہو مجھے بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ درجنوں خطوط لکھے، ٹیلی فون کرتی رہی لیکن جواب ندارد آخر ہماری محبت کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟

حسن! کیا میری محبت کو اب اتنا مجھے بھی حق حاصل نہیں کہ میں تم سے وہی پہلے سے خوش گوار لمحے طلب کرسکوں۔ یہ میری التجا ہے۔ کیا اسے شرف قبولیت بخشا جاسکتا ہے کیا میرے دلِ شکستہ کی یہ آرزو پوری ہوجائے گی۔ کیا تم یہ پسند کرسکو گے کہ تمھارے ہجر کی ماری تمھارے ہونٹوں سے تسکین کے دو لفظ سنے بغیر اس دنیا سے گزر جائے؟ نہیں... نہیں تم یقیناً اتنے بے رحم نہیں ہو تم کیا جانو حسن! یہ میری کس قدر شدید خواہش ہے کہ مجھے تمھارا التفات مل جائے تاکہ میں تمھارے پائے ناز پر سر رکھ سکوں۔ تمھاری حسین یادوں کے طفیل میں نے اپنی راتوں کی نیندیں نثار کردیں اس امید پر کہ ایک نہ ایک دن میری تقدیر پلٹا کھائے گی اور تم واپس جلد لوٹ آؤ گے۔ حسن! میں تمھیں کچھ نہیں کہتی۔ خدارا مجھے بس اتنا بتادو کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جارہی ہے تاکہ میں اپنے اس قصور اور غلطی کو سدھارنے کی کوشش کروں۔ تمھارا ٹمی اب اسکول جانے لگا ہے۔ ماشاء اللہ بڑا ذہین ہے فرفر نظمیں سناتا ہے۔ کہتا

ہے یہ سب نظمیں اپنے پیارے ڈیڈی کے لیے یاد کی ہیں انھیں سنایا کروں گا تمھاری تصویر کو چومتا ہے اور سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ اگر میرے لیے نہیں تو کیا تم ٹمی کے لیے بھی لوٹ کر نہ آؤ گے... عید آرہی ہے۔ مگر میرے لیے تو یہ عید بھی محرم سے کم نہیں۔

حسن! تمھیں اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہوں ایک بار تو میری زندگی کے خزاں آلودہ چمن میں بہار بن کر لوٹ آؤ۔

تمھاری منتظر

تمھاری اپنی جانم

میں نے یہ خط احتیاط سے لفافہ میں بند کر کے اپنے پرانے ملازم بابا فضل کو دیا اور اسے لاہور روانہ کر دیا اور میں اسی دن سے اپنے اس خط کا انتظار کرنے لگی۔

تیسرے دن بابا فضل افسردہ سی صورت بنائے واپس لوٹا تو اسے اکیلا دیکھ کر میں مایوس ہوگئی حالاں کہ مجھے یقین تھا کہ حسن میرا خط پاتے ہی بابا کے ساتھ چلے آئیں گے مگر انھوں نے تو خیریت کی دو سطریں تحریر کرنے کی بھی زحمت نہ کی۔ میں نے بابا سے حسن کے بارے میں جب تفصیل پوچھی تو انھوں نے مجھے جو بتایا اسے سن کر میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

بابا فضل نے بتایا کہ

''حسن نے ایک امیر صنعت کار کی بیٹی سے شادی کر لی ہے جو اپنے ساتھ دھن دولت اور بنگلہ لے کر آئی ہے اور اب بڑے ٹھاٹھ سے وہ بنگلے میں رہتے ہیں۔ میں نے جب آپ کے خط کا جواب مانگا تو مجھے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔''

بابا آنسو بہا رہا تھا اور میں اندر ہی اندر تڑپتے سسکتے یہ محسوس کر رہی تھی کہ جیسے مجھے پہلے ہی سے علم تھا۔ حسن کے مزاج میں چمکتی دمکتی دنیا کے لیے بہت کشش ہے اور جو کچھ ہوا اسے ایک نہ ایک دن تو ضرور ہونا تھا۔ انسان کی ایک کم زوری یہ بھی ہے کہ وہ بہت جلد خوش فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے، شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے پھر سے اُمیدیں باندھنی شروع کر دیں اور میں اُمیدوں، خواہشوں اور امنگوں کے گرداب میں زندگی بسر کرنے لگی۔ میں سوچتی تھی کہ آنے والا کل میرے لیے خوشیوں کا پیغام لائے گا اور حسن ضرور آئیں گے میں منتظر تھی کہ جب

حسن آئے گا تو بہاریں لوٹ آئیں گی اور ایک نیا جہاں جنم لے گا۔ اُمید کی کرنیں میرے خوابوں کے افق کو روشن کر رہی تھیں اور پھر آہ...

ایک دن حسن آ گئے۔ میں کافی عرصے سے اس حسین دن کی منتظر تھی۔ مگر آہ یہ دن تو میرے لیے تباہیاں لے کر آیا تھا۔

حسن کو دیکھتے ہی ہمارے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اُٹھے تھے میں اور ٹمی بڑے بے تاب اور والہانہ انداز سے ان کی جانب بڑھے مگر... انھوں نے مجھ پر پیار کی بجائے حقارت کی نگاہ ڈالی اور ننھا جو ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا تھا اسے بڑی بیدردی سے جھڑک دیا۔ وہ غریب سہم کر مجھ سے لپٹ گیا میں ان کے لیے چائے بنا کر لائی تو انھوں نے ٹرے کو ایسی ٹھوکر لگائی کہ تمام چیزیں فرش پر لڑھک گئیں۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے میں نے ان کی طرف دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ بہت حسین وقت گزارا تھا۔ کاش انھوں نے ان لمحوں کی قدر کی ہوتی وائے افسوس...

حسن بڑی بے دردی سے گھر کا سامان نکال رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت اپنی نظروں کے سامنے اپنے آپ کو لٹتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ تنکا تنکا جوڑ کر جو آشیانہ بنایا تھا وہ اب تباہ ہو رہا تھا۔

پھر وہ میرے کمرے میں آئے میں نے حسرت بھری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا میرے چہرے سے حزن و ملال عیاں تھا اور ٹمی تو بالکل حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا مگر حسن کے پتھر دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جب وہ اپنی تصویر بھی اٹھانے لگے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں انتہائی جذباتی ہو کر کہنے لگی۔

''حسن! تم اپنی ستم آرائیوں سے میرے دل کو پائے حقارت سے مسل ڈالو، کچل ڈالو حسن! میں تمھیں منع نہیں کروں گی لیکن میں تم سے صرف اپنی محبت کا حق طلب کرتی ہوں۔ یہ تصویر میری محبت کی یادگار ہے۔ اس تصویر کو میرے پاس رہنے دو کیا تم مجھے میرے اس حق سے بھی محروم رکھو گے۔ نہیں حسن! میں تمھیں اپنی محبت اور ان حسین لمحوں کا واسطہ دیتی ہوں جو

ہم نے باہم گزارے تھے کہ اس آخری یادگار کو میرے پاس رہنے دو'' اگر حسن کی جگہ کوئی پتھر بھی ہوتا تو میرا نالہ وفریاد سن کر پانی بن جاتا مگر ان کا دل تو پتھر سے زیادہ سخت ہو چکا تھا۔ وہ کہنے لگے۔

''تم نے بابا کے ہاتھ خط بھیج کر میری پُرمسرت زندگی میں آگ لگا دی ہے اب میں بھی تمھیں روتا اور بلکتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ساری عمر یوں ہی پچھتاتی اور ترستی رہو گی۔ یہی سزا ہے تمھاری۔'' انھوں نے غصہ سے کہا۔

میں نے پوچھا آخر میرا قصور کیا ہے؟ ناکردہ گناہوں کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے؟''

''تمھارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ تم ایک متوسط گھرانے کی معمولی لڑکی ہو جو ہمارے ہی ٹکڑوں پر پلی اور پروان چڑھی ہو۔ نہ جانے ابا حضور کو تمھاری کون سی ادا پسند آئی تھی جو تمھیں میرے سر پر مسلط کر دیا، تمھیں تو آداب محفل ہی نہیں آتے، کبھی تم نے ڈھنگ کے کپڑے نہیں پہنے، تمھیں اگر پارٹیوں میں ساتھ لے کر جاؤں تو تم سر پر دوپٹہ کو یوں جما لیتی ہو کہ آدھا چہرہ آنچل میں چھپ جاتا ہے تم مشرقی خیالات کی دقیانوسی عورت ہو، تمھیں تو نہ چلنے پھرنے کی تمیز ہے اور نہ ہی اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، باتیں بھی کرتی ہو تو قبل از مسیح کی میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حسن تم اس بی مولانی کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟ میں دوستوں کی ایسی باتیں سن کر ہمیشہ شرمندہ ہوتا ہوں تم اس قابل نہیں ہو کہ میری بیوی کہلا سکو۔''

حسن کے الفاظ کا زہر قطرہ قطرہ میری رگوں میں اُتر رہا تھا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں قوت گویائی اور سماعت سے محروم ہوگئی ہوں میری زندگی کے ورق بکھرتے چلے جا رہے تھے، پیروں تلے سے زمین سرکتی جا رہی تھی۔ حسن نے میرے ہاتھ سے تصویر چھیننی چاہی۔ اسی چھینا جھپٹی میں تصویر نیچے گر گئی اور اس کا فریم چکنا چور ہوگیا۔ حسن نے تصویر کے پرزے پرزے کر کے فرش پر بکھیر دیے میں ایک دم پتھر کی ہوگئی۔

''حسن! تم نے اس تصویر کے نہیں بلکہ میرے ساز دل کے تمام تار توڑ دیے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے سپنوں میں ہمیشہ تم ہی رہو گے۔''

میں نے لرزتے لبوں سے کہا اور باہر چلی آئی۔ ٹمی بھی میرے ساتھ سہما ہوا چلا آیا

وہ بہت حیران و پریشان تھا۔

میں گلاب کے جھنڈ کے قریب گھاس پر بیٹھ گئی جذبات کا طوفان آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ طائرانِ خوش نوا بھی میرے ساتھ انتہائی افسردہ ہیں۔ سفیدا کے درخت بھی سوگوار تھے۔ آخر کار اس سوگوار فضا میں رات کی سیاہ چادر پھیلنا شروع ہوگئی۔ میری آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ ٹمی نے ننھے منے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''نہ رو میری ممی۔'' میں ڈیڈی کو بندوق سے ٹھائیں کر دوں گا۔''

''تڑاخ'' میں نے ایک زناٹے دار چانٹا ننھے کی گال پر جڑ دیا۔ ٹمی کرب سے بلک اٹھا اور پھر میں ٹمی کو گلے سے لگائے سسکیاں لینے لگی۔ میری انگلیوں کے جو نشان اس کے پھول جیسے گالوں پر پڑ گئے تھے انھیں میں اپنے بوسوں سے مٹانے لگی۔ میں روتی رہی اور ممتا کا آنچل بھیگتا رہا۔

حسن واپس لاہور چلے گئے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری زندگی ہی سے چلے گئے ہیں۔ میں آخری بار انھیں الوداع بھی نہ کہہ سکی تھی۔ وہ میری کشتی کا ناخدا تھا مگر اس نے میری ناؤ بھنور میں چھوڑ دی تھی۔

کشتیِ دل ہوگئی اُمید کے دریا میں غرق
اے تقدیر تکتے رہ گئے ساحل سے ہم

بابا فضل نے بتایا کہ حسن جاتے جاتے کہہ گئے ہیں۔

''یہ بنگلہ کرایہ پر اٹھا دیا ہے اور تم لوگوں کے لیے سرونٹ کوارٹرز میں سے دو کوارٹر کافی ہیں۔ ہر ماہ دو ہزار روپے خرچ کے لیے بھیج دیا کروں گا۔''

یہ ایک ایسی قیامت تھی جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی گویا میں اپنے ہی گھر میں بے گھر ہوگئی تھی۔ آخر مختصر سا سامان (جو حسن ہماری ضرورت کے لیے چھوڑ گئے تھے) لے کر ہم کوارٹرز میں منتقل ہوگئے اور حسن کی محبت اور رفاقت صرف کاغذ کا پھول بن کر رہ گئی تھی۔

بد نصیبی نہیں تو پھر کیا ہے
میرا گلشن بہار کو ترسے

سسکتی بلکتی زندگی بسر ہونے لگی۔ میرا اگر کوئی ہمدرد اور مونس وغمگسار تھا تو وہ بابا فضل تھا جو پوری وفاداری سے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ حسن کا خیال آتے ہی دل ڈوبنے لگتا تنہائی میں زندگی سے فرار حاصل کرنے کے خیالات آنے لگتے۔ مگر ٹمی کا معصوم سا چہرہ ہمیشہ آڑے آجاتا ہے۔ اب میں زندہ تھی تو صرف ٹمی کے لیے۔

درد وکرب کے لاکھوں طوفان میرے دل سے اٹھ رہے تھے۔ آنکھوں کے چشمے روتے روتے خشک ہوگئے اور اب آنسوؤں کی جگہ حسن کے انتظار نے لے لی۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس قدر دُکھی تو میں اس وقت بھی نہ تھی جب میرا اکلوتا بھائی مجھے زمانے کے حوادث کے سپرد کرکے راہی ملک عدم ہوگیا تھا۔

ٹمی سمجھ دار بچہ تھا اپنے ڈیڈی کی عدم موجودگی کا اس کے دل پر بھی بہت زیادہ اثر تھا کبھی کبھار وہ بنگلے میں گھومتا یا باغ میں چلا جاتا۔ باغ میں وہ پھولوں سے کھیلتا رہتا تھا اور پھولوں کو توڑ دیتا تھا۔ بنگلے میں مقیم کرایہ داروں نے کئی بار ٹمی کو ڈانٹا۔ اسے جب بھی ڈانٹ پڑتی وہ روتا ہوا آتا اور اسے روتا دیکھ کر میری اور بابا فضل کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے جھلملانے لگتیں میں اسے منع کرتی تھی کہ باغ میں مت جایا کرو۔"

وہ جواب دیتا "کیوں نہ جاؤں ممی! یہ تو ہمارا اپنا باغ ہے۔" اور میں ٹمی کے اس جواب پر تڑپ اٹھتی تھی۔

حسن نے مجھے کسی پتنگ کی طرح اپنے پیار ومحبت کی ڈور سے فضا میں بہت اونچا آسمان تک پہنچا دیا لیکن پھر اس پتنگ کو بلندیوں تک پہنچا کر ڈور ایک دم ہاتھ سے چھوڑ دی تھی نتیجہ یہ کہ میں کٹی پتنگ کی مانند زمانے کی تند وتیز ہواؤں کے ساتھ ڈولتی پھر رہی تھی۔ میں نے بڑی تگ ودو کے بعد ایک فرم میں ملازمت کرلی تھی مگر اس دفتر میں بھی بھیڑیے نظر آئے جو دانت نکوسے ہوتے تھے۔ جوان اور خوب صورت عورت کا اس معاشرے میں اکیلے جینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے دفتر میں آدمیوں کے روپ میں جب بھیڑیوں کو دیکھا تو چند دن

بعد ملازمت چھوڑ دی۔ ایک بار پھر میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتی پھر رہی تھی۔ تندیِ بادِ مخالف، اِدھر اُدھر اُڑاتی پھر رہی تھی۔

باجی اور دادا ہمایوں میرے حالات سے بے خبر سمندر پار خوش وخرم زندگی بسر کررہے تھے۔ میں اپنا دُکھ ان پر ڈالنا نہیں چاہتی تھی میں سوچا کرتی تھی کہ اپنی تباہی وبربادی کی داستانِ الم انھیں سنا کر کیوں پریشان کروں۔ ان کو جو خط لکھتی تھی ان میں ہمیشہ اپنی خوش بختی کا ذکر کیا کرتی تھی۔

فلک کج رفتار کی ستم ظریفی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ میرے ستارے مسلسل گردش میں تھے۔ میرا آخری سہارا بابا فضل تھا کہ ایک روز اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ معلوم ہوا کہ نمونیہ ہوگیا ہے۔ اسی نمونیہ کی وجہ سے وہ مجھے اس پاپی دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اگلے جہان سدھار گئے اور میں دُکھ سہنے کے لیے تنہا رہ گئی۔ میری زندگی مصائب وآلام کا مسلسل شکار ہوکر رہ گئی اور اب تو میں روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہوگئی تھی۔

ٹمی کا رونا اور بلکنا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا آخرکار بہت سوچ بچار کے بعد میں نے لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ گھر کا تمام سامان اونے پونے داموں فروخت کرکے آخرکار ایک روز لاہور کے لیے روانہ ہوگئی تاکہ ٹمی کو حسن کے سپرد کرسکوں۔

☆

حسن سے کسی بھلائی کی اُمید کرنا بے وقوفی تھی کیوں کہ دولت کی ہوس نے اسے اندھا کرکے خون کے رشتوں کی پہچان سے بھی عاری کردیا تھا۔ اس کے باوجود میں چھوٹی سی اُمید لے کر لاہور میں "حسن وِلا" پہنچ گئی۔ میرے قدم تو ڈگمگا رہے تھے لیکن دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا، "حسن وِلا" میں داخل ہوکر میں نے دیکھا کہ حسن کی نئی بیگم لان میں بیٹھی کتوں سے دل بہلا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ایک رشین کتا ہمارے استقبال کے لیے لپکا۔ ٹمی سہم کر میرے ساتھ چمٹ گیا۔

"ٹمی" ادھر آؤ بیگم صاحبہ نے کتے کو چمکارا اور وہ دم ہلاتا ہوا بیگم کے پاؤں میں

ٹوں ٹوں کرنے لگا۔

"ٹمی" کے الفاظ سے میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے بے شمار بچھوؤں نے میرے دل میں ڈنگ مار دیا ہو۔ میں سلام کر کے وہیں گھاس پر بیٹھ گئی اور بیگم صاحبہ سے کہنے لگی۔

"بیگم صاحبہ! میں ایک مجبور اور نادار عورت ہوں پے در پے حادثات اور واقعات کی وجہ سے میں اپنا گھر بار اور سب کچھ لٹا چکی ہوں۔ میرا پھول جیسا بچہ فاقوں سے بے حال ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے کسی رحم دل اور مخلص خاتون کے سپرد کر دوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بہت غریب پرور اور خدا ترس خاتون ہیں براہ کرم آپ مجھے کوئی نوکری دے دیں میں دل و جان سے آپ کی خدمت کروں گی۔ محنت اور جانفشانی سے آپ کے گھر کا کام کروں گی اور جوں ہی میں اپنے بچے کو کسی خاتون کے سپرد کر دوں گی یہاں سے چلی جاؤں گی۔" میں نے انتہائی درد و کرب سے اپنی داستان سنائی۔ اس پر بیگم نے کہا۔

"یہ یتیم خانہ نہیں ہے۔ کسی یتیم خانے جاؤ۔"

"جب مجھے دُرِ مقصود یہاں حاصل ہو سکتا ہے تو پھر میں وہاں کیوں جاؤں۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ بڑی مخلص اور غریب پرور ہیں نا، اس لیے مجھے دُرِ مقصود یہیں سے مل سکتا ہے۔ میں نے بات کو پلٹ دیا۔

"تمھاری کہانی سن کر افسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم بیوہ ہو؟"

"جی! بیوہ سہاگن ہوں۔" اس تلخ جواب پر میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے اور میں نے انھیں بڑی مشکل سے روکا۔

بیگم صاحبہ نے کہا "میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

میری کشتی کا مانجھی مجھے بھنور میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر بتاؤ میں تمھاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔" بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"جی میری مدد... جی میں تو..." میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ آخر بمشکل تمام میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

"جی! مجھے کوئی ملازمت مل جائے تو یہ احسان تا زیست نہ بھولوں گی۔" میں نے انتہائی منّت اور عاجزی سے کہا۔

"تم کیا کچھ کر سکتی ہو؟"

"آیا گیری اور باورچی کا کام بہ خوبی کر سکتی ہوں۔"

"آیا کی تو فی الحال ضرورت نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

میری نظریں ان کی ساڑھی کے اندر اُبھرے ہوئے پیٹ پر پڑیں اور نہ جانے کیوں میں افسردہ سی ہو گئی شاید میری یہ افسردگی اس بنا پر تھی کہ ہونے والا بچہ میری سوتن کا ہے یا شاید اس لیے رنجیدہ تھی کہ یہ بھی ایک دن حسن کے ہوتے ہوئے ٹمی کی طرح بے آسرا اور بے سہارا ہو جائے گا۔ کیوں کہ حسن کی حُسن پرست اور لالچی طبیعت کو دیکھتے ہوئے سب کچھ ممکن تھا۔

"تو پھر میں مایوس ہو جاؤں؟" میں مری ہوئی آواز سے بولی۔

"نہیں ناکام ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آج کل ایک خانساماں کی ضرورت ہے اچھا ہوا کہ تم مل گئیں۔ چہرے سے تم شریف خاتون لگتی ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم محنت اور دیانت داری سے کام کرو گی۔" پھر اچانک وہ اپنے کتے سے بولیں۔

"ٹمی! آرام سے بیٹھو۔"

"میں نے تو کوئی شرارت نہیں کی۔" ننھا ٹمی معصومیت سے بولا۔

"اوہ! یہ کتنا پیارا بچہ ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چہرہ میں نے کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہیں آ رہا ہے کہ کب اور کس جگہ دیکھا ہے؟" میرا دل چیخ اٹھا اور میں اپنے دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "بیگم صاحبہ آپ یہ چہرہ اس کے ڈیڈی کے روپ میں ہر روز اسی بنگلے میں دیکھتی ہیں۔" مگر میرے لبوں سے آواز نہ نکل سکی۔

بیگم صاحبہ نے پوچھا، "ننھے! کیا نام ہے تمھارا؟"

"جی! میرا نام تو عثمان ہے مگر میرے ڈیڈی پیار سے ٹمی کہتے ہیں۔" وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

"اوہو! یہ نام تو میرے کتے کا بھی ہے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"جی ہاں! اس زمانہ میں انسانوں سے زیادہ کتوں کی قدر ہوتی ہے۔" میں نے کسی قدر دکھی لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ مجھے باورچی خانہ میں لے گئی۔ اور شام کے کھانے کے متعلق ہدایات دے کر چلی گئی۔ میں فوراً ہی باورچی خانے کے کاموں میں جت گئی۔ پہلے اسے صاف کیا، برتنوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی جگہوں پر طریقے سے رکھا اور پھر کھانا تیار کرنے لگی۔ حسن کی بے وفائی اور ظلم و ستم کے باوجود میں اُن سے نفرت نہ کر سکی، کیوں کہ پانچ برس سے میرے دل میں اب بھی حسن کی محبت تھی البتہ سوتن کا تصور میرے جسم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ حسن کی نئی بیگم صاحبہ کو دیکھ کر مجھے حسد کا احساس نہیں ہوا تھا بلکہ میں سوچتی تھی کہ یہ تو میرے دیوتا کی ایک دوسری پجارن ہے۔ اچانک میرے کانوں میں ٹمی کی آواز آئی۔

"ممی! ممی! ڈیڈی آئے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ ٹمی کچن کے دروازے پر کھڑا خوشی سے تالیاں بجا رہا تھا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ حسن، کار میں سے نکلے تو ان کی نظریں ہم دونوں پر پڑیں اور ان کی پیشانی پر غصے کی سلوٹیں نظر آنے لگیں۔ وہ ریکٹ کو گھماتے کمرے میں چلے گئے۔ میں جلدی جلدی ان کی من پسند ڈشیں تیار کرنے لگی۔

دو دن بغیر کسی حادثہ کے گزر گئے مگر تیسرے دن آہ! اس دن میں مہمانوں کے لیے سموسے بنا رہی تھی۔ اور ٹمی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

"ممی! آپ کو یہاں کام کیوں کرنا پڑ رہا ہے۔"

بیٹے! خانساماں چھٹی پر گیا ہوا ہے نا! اس لیے کام کرتی ہوں۔" میں نے ننھے کو

تسلی دی۔

"ممی! آپ مجھے ڈیڈی سے کیوں نہیں ملنے دیتیں۔" ٹمی منہ بسورتے ہوئے بولا۔

میں ٹمی کے اس سوال پر پریشان ہوگئی۔ لیکن اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

"شاید اس لیے کہ اب ڈیڈی جلاد ہوگئے ہیں۔" چار سالہ بچے کی اس فراست پر میں بھونچکی سی ہو کر رہ گئی۔

"نہیں بیٹے! وہ تو تمھارے بڑے ہی اچھے ڈیڈی ہیں۔" میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا بچہ ان سے نفرت کرنے لگے۔

اچانک حسن آ گئے۔ ان کے چہرے پر شدید غصہ تھا۔ وہ حقارت سے بولے۔

"مکار عورت! تو یہاں بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتی تمھیں نادار اور بے سہارا سمجھ کر میں نے تم سے شادی کی تھی لیکن اب تم یہاں آ کر مجھے ناگن کی طرح ڈس رہی ہو اور میرے بیٹے سے غلط سلط کی باتیں کر رہی ہو تاکہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک جھٹکے سے ٹمی کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ سہما سہما سسکیاں لے رہا تھا۔

"حسن! ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو اور میں تمھاری قصوروار بن گئی ہوں مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مجھے یوں حقارت سے ٹھکرا دیں آخر میں آپ کی بیوی ہوں۔" آخر کار میری زبان پر شکوہ آ ہی گیا اور پھر میں نے کہا۔

"حسن! آپ مجھے بے شک ٹھکرا دیں میں تم سے شکایت بھی نہ کروں گی مگر معصوم ٹمی پر رحم کریں اس کے گلاب جیسے گالوں پر ترس کھائیں یہ گال تمھاری جدائی کی وجہ سے کمھلا گئے ہیں۔"

"خاموش!" وہ زور سے چیخے۔ تمھاری گفتگو سے میری طبیعت خراب ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے کڑکڑاتے ہوئے گھی کی کڑاہی پر زور سے ٹھوکر جاری اور یہ کڑکڑاتا گھی سیدھا میرے چہرے اور آنکھوں پر گرا۔ میری چیخیں نکلنے لگیں۔ میں چیخ رہی تھی، تڑپ رہی

تھی۔ آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس ظلم کے باوجود حسن کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔

میری بدقسمتی نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ گرم گرم کڑکڑاتا ہوا گھی میری آنکھوں اور چہرے پر پڑ گیا پھر میری آنکھوں میں تاریکی کی خلیج حائل ہوگئی جس نے میری نظروں سے دنیا کو اوجھل کر دیا۔ میرا تن من مثل گلخن جل رہا تھا، پھنک رہا تھا۔ گلخن افروز نے مجھے جلتی بھٹی میں جھونک دیا۔ میری زندگی نرک بن گئی۔ میں جو اپنے آپ کو ایک مضبوط چٹان سمجھتی تھی حسن کی ایک ہی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے ظلم وستم کو دیکھ کر چشم فلک بھی اشک بار تھی گردش دوراں نے ابھی تک مجھے سکون نہ لینے دیا تھا۔ آنسو موج بلا خیز کی طرح خون کے ساتھ تیزی سے بہہ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں پیار کی جوت جگانے والے نے مجھے اندھیروں میں پھینک دیا تھا۔ حسن کے دیے ہوئے زخم نقش ہو کر رہ گئے۔ اس نے گویا میرا وجود اپنی زندگی کی لغت سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا گویا اب میں اس کے لیے مبغوض ترین بن کر رہ گئی تھی۔

☆

''نغمہ! اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔''

میں باجی مریم کی طویل داستانِ رنج والم پورے انہماک سے سن رہی تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بے حد افسردہ تھی اور جب باجی نے یہ کہا تھا کہ:

نغمہ!''... پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔''

یہ جملہ سنتے ہی میں کانپ کر رہ گئی کیوں کہ اس جملے کا تعلق براہِ راست میرے بھائی حامد سے تھا۔ میرے بھائی نہ صرف مسٹر حسن کے دوست تھے بلکہ فیملی ڈاکٹر بھی تھے، باجی مریم کے حادثے والے دن مسٹر حسن انھیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں لے کر علاج کے لیے بھائی کے پاس پہنچے اور بھائی سے کہنے لگے۔

''ڈاکٹر! یہ ہماری نئی باورچن ہے آج سموسے بناتے وقت کھولتے ہوئے گھی کی کڑاہی میں گر گئی تھی جس سے یہ زخمی ہوگئی ہے اس کا دماغی توازن کچھ ٹھیک نہیں ہے ہمارے کتے ٹمی سے بہت پیار کرتی ہے اور جنون کی حالت میں ٹمی ٹمی پکارتی رہتی ہے۔''

بھائی حامد جس وقت گھر آئے تو بہت ہی پریشان تھے۔ میں نے اس اضطراب کی وجہ پوچھی تو بولے... نغمی! کیا بتاؤں۔ آج ان آنکھوں نے انسان کے ظلم وستم اور سفاکیوں کا کیسا دردناک منظر دیکھا ہے کہ میری روح کانپ کر رہ گئی ہے۔ یا خدا! اتنی بے رحمی اس قدر سنگ دلی، اس درجہ ستم آرائی اُف! نغمی، آج میرے پاس ایک مریضہ لائی گئی اس کا نام مریم ہے مجھے اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ ملازمہ ہے مگر وہ اپنے حُسن اور شائستہ لب ولہجہ سے ملازمہ معلوم نہیں ہوتی۔ مجھے بتایا کہ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے مگر میں نے دیکھا وہ تو بہت حاضر دماغ ہے اور جس کتے کا نام ٹمی مجھے بتایا تھا، نغمہ! یہ سن کر تم حیران ہوگی کہ ٹمی اس کے بیٹے کا نام ہے جس کی خاطر وہ زندہ رہنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ حسن کی بیوی ہے اور حسن ہی نے اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے۔

''بھائی جان! یہ میں کیسے یقین کرلوں جب کہ حسن بھائی تو بہت پاکیزہ اور اعلیٰ و ارفع خیالات کے مالک ہیں۔ ان کا ادبی اسلوب سلجھا ہوا اور دل کش ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی ہر تخلیق میں عورت کو مقام ثریا تک پہنچا دیتے ہیں ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک مباحثہ میں انھوں نے عورتوں کے حقوق پر اتنی عمدہ تقریر کی تھی کہ ساری محفل کو لوٹ لیا تھا پھر وہ ایک عورت پر ایسا ستم کیسے کر سکتے ہیں؟''

''دراصل تم ایک ناتجربہ کار اور بھولی بھالی لڑکی ہو۔ یہ نہیں جانتی کہ عموماً ادیب کے ہاں صرف تخیل کی پرواز ہوتی ہے عمل وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی گھریلو زندگی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے۔ حسن بھی محض اپنی چرب زبانی کی بناء پر لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔''

''یقین نہیں آتا۔''

''چلو تمھیں اس کا زندہ ثبوت دکھاؤں۔'' میں اسی وقت بھیا کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔

''مریم بھی تمھاری طرح سادہ دل اور معصوم خاتون ہے۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی حسن کو برا نہیں سمجھتی بلکہ اپنی تقدیر کو دوشی قرار دیتی ہے۔'' بھائی جان نے کار اسٹارٹ کرتے

ہوئے کہا۔

جب میں ہسپتال پہنچی تو وہاں پلنگ پر باجی مریم کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور میں حسن بھائی کے اس بھیانک ظلم پر ششدر رہ گئی۔ میری نگاہوں میں حیرت و عبرت کے کتنے ہی الم ناک افسانے گھومنے لگے۔

''باجی آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ کی آنکھیں آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' بھائی جان انھیں تسلی دے رہے تھے۔

''لیکن میں ان آنکھوں کو ٹھیک نہیں ہونے دوں گی۔ ان بے نور آنکھوں کے ساتھ حسن کے چہرے کی آخری یاد وابستہ ہے۔ اب تو حسن کی بے اعتنائی اور سرد مہری سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ میری محبت جو حسن سے ہے، عام محبتوں سے بالکل علاحدہ ہے افسوس کہ مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں اس کا صحیح مفہوم بیان کر سکوں۔'' بے جان اور سوکھے پتوں کی مانند ان کے لبوں سے الفاظ گر رہے تھے۔

''تعجب ہے اب بھی آپ حسن بھائی کو متاعِ زندگی سمجھتی ہیں جس کے جور و ستم نے آپ کا خوب صورت حُسن نہ صرف گہنا دیا ہے بلکہ آنکھوں کے دیے بھی گل کر دیے ہیں۔ یہ قیامت ہی تو تھی اس سے بڑھ کر آپ کے لیے اور کیا قیامت ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''میں زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں اب تو میرے دل میں ناکام تمناؤں کا ایک طوفان سا برپا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ حسن اور ٹمی آ کر مل جائیں۔ میرا بچہ میری کل کائنات ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتی میرے لیے اس کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔ اب میں کس کے ساتھ اپنے دکھ اور غم بانٹوں؟ وہ کون ہے جو میری ناؤ کو بے یقینی کی منجدھار سے نکال کر کنارے تک پہنچائے گا اور اس کو دریا برد ہونے سے بچا سکے گا۔ چاروں طرف نظر دوڑانے پر بھی مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا، جن پر تکیہ تھا وہی جہنم میں جھونکنے لگے حسن نے جو زخم دیے ہیں وہ شائد کبھی مندمل نہ ہوں گے۔ نغمی! اب تو میری تمنا صرف یہی ہے کہ ایک بار ٹمی سے مل لوں وہ کیسا ہے میری یاد میں کتنا تڑپ رہا ہو گا۔ بس آخری یہی التجا ہے کہ میرا بچہ میرے پاس آ جائے۔''

باجی مریم کی یہ دردناک باتیں سن کر میرا دل بھی اُمڈ آیا اور میں نے کہا ''باجی! آپ مطمئن رہیں۔ آپ کی اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔''

سورج دیوتا دُور درختوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا اور سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں باجی کو ساتھ لیے کمرے میں آئی۔ ایک دم باجی بلبلا اٹھیں اور اپنے گال پر ہاتھ رکھے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ شدید تکلیف کی وجہ سے تڑپ رہی تھیں۔ اچانک وہ ایک بار پھر تڑپیں۔

''کیا ہوا باجی!'' میں گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں پیاری نغمی! مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ٹمی کے رخسار پر تھپڑ مارے ہیں اور اس کے تڑپنے اور بلکنے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ خدا کے لیے نغمی میرے ٹمی کو ان جلادوں سے بچاؤ آہ! میرا ٹمی۔''

باجی بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ جیسے جان کنی کے عالم میں ہوں۔ اس اثنا میں بھائی جان بھی آ گئے۔ میں نے تڑپتی ہوئی باجی کو پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر بھیا نے ان کی نبض دیکھی اور پھر ان کو دوا کی خوراک دی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کی دوا مجھے زندگی نہیں بخش سکتی زندگی تو مجھ سے روٹھ کر بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اتنی دُور کہ اگر اسے تلاش کرنے بھی نکلوں تو اسے نہ پا سکوں گی۔'' وہ نحیف آواز میں بولیں۔

باجی کا چہرہ زرد تو پہلے ہی تھا۔ اب نیلا پیلا سا ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر بھائی جان کی طرف دیکھا۔

''نغمی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اندرونی طور پر کسی شدید صدمے میں گرفتار ہیں جس کے اثرات ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔''

باجی مریم نالہ سوزاں سے کہہ رہی تھیں۔'' آہ میرا ٹمی! خدارا ڈاکٹر! میری التجا ہے

کہ میرے ٹمی کو مجھ سے ملا دو۔"

"نغمی! چلو ابھی جا کر لے آتے ہیں۔" بھیا بولے۔

باجی نے ایک پیغام مجھ سے لکھوایا اور ہم کار میں بیٹھ کر حسن کے بنگلے میں پہنچے تو وہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ حسن صاحب سسکیاں لیتے ہوئے ننھے ٹمی کو سینے سے لگائے ہوئے چیخ رہے تھے۔

"تم نے ٹمی کو نہیں مارا بلکہ میرے دل کو زخمی کیا ہے۔" حسن نے کہا۔

"اس نے بھی تو میرے کتے کی ٹانگ کو زخمی کر دیا ہے۔" بیگم صاحبہ بھی غصے سے بولیں۔

"خاموش ہو جاؤ نگہت! تمہارے اس سلوک نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم ایک کتے کو معصوم بچے پر ترجیح دے رہی ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک شریف خاتون اور سوسائٹی گرل میں کتنا فرق ہوتا ہے کاش مجھے پہلے سے اس کا اندازہ ہوتا تو میرا خاندان یوں تباہ و برباد نہ ہوتا۔"

میں نے اس معمولی نین نقش والی نگہت اور باجی کی شکلوں کا موازنہ کیا تو مجھے حسن کی کور ذوقی پر بہت غصہ آیا۔ کہاں مریم کا حسین و معصوم چہرہ! اور کہاں یہ چہرہ مکمل سیکس فیکٹر کا اشتہار پیش کر رہا تھا۔

"یار حسن! یہ کیا معاملہ ہے۔" بھائی جان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

وہ دونوں چونک پڑے۔ "اوہو نغمہ بہن آداب! مزاج تو بخیر ہیں۔" حسن بھائی بولے۔

"جی ہاں آپ کی دعا ہے۔" میں قدرے بیزاری سے بولی۔

مجھے حسن بھائی سے نفرت سی ہو گئی۔ ننھا ٹمی کملائے ہوئے پھول کی مانند پژمردہ تھا۔ وہ کچھ حیران سی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔

نگہت، حسن پر قہر آلود نگاہیں ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"کہیے نغمہ بہن! آپ کی افسانہ نگاری کا کیا حال ہے؟ عرصے سے آپ کا کوئی افسانہ کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔" حسن بھائی بولے۔

"اس وقت تو میں، آپ لوگوں کے حالاتِ زندگی کو سطحِ قرطاس پر لانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

اور ہاں مسٹر حسن! آپ تو حقوق نسواں کے علم بردار ہیں اور مریم کے ساتھ اتنا دردناک سلوک اور ایسی بربریت آپ نے تو ظالموں کو بھی مات کر دیا۔ شیطان بھی آپ کے اس سنگین رویہ کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہوگا۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا آپ کا شیوہ تو نہ تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

"مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میں تمام زندگی اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں بڑا اپرادھی ہوں۔" حسن پھٹی پھٹی نظروں سے میری جانب دیکھ کر بولے۔

"کیوں بھئی ٹمی! اپنی ممی کے پاس چلو گے نا؟" میں نے ننھے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ اس نے خوشی سے اثبات میں سر ہلایا اور میری گردن میں اپنے ننھے منے بازو حمائل کر دیے۔

میں نے باجی کا پرچہ حسن بھائی کے ہاتھ میں تھما دیا جس پر لکھا تھا۔

"میرے مسیحا! کیا تم مجھے تڑپتا، بلکتا ہوا بھی دیکھنے نہ آؤ گے؟"

چلے جائیں گے تیرے جہاں سے ہم

ہمیشہ تمھاری جانم

"نہیں! نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آؤں گا اور ضرور آؤں گا اپنے مضطرب جذبوں کو تسکین دینے۔" حسن ایک دم جیسے کراہ اٹھے۔

"ڈاکٹر حامد! کیا مریم کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا میں اسے دوبارہ پا سکوں گا۔ اس کا اب کیا حال ہے؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

"شکر ہے اللہ کا! تمھیں بھی حرماں نصیب مریم کا کچھ خیال تو آیا۔ صرف تمھارا التفات محبت اسے زندگی بخش سکتا ہے۔" بھائی جان بولے۔

"اب کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ باجی موت کی عمیق گہرائیوں میں گرتی جا رہی ہیں۔" میں نے طنز اور حقارت سے کہا اور ٹمی کو لے کر کار میں بیٹھ گئی۔ بھائی جان اور حسن بھائی بھی بیٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو باجی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

تڑپ رہے ہیں شبِ انتظار سونے دے
نہ چھیڑ ہم کو دلِ بے قرار سونے دے

باجی اپنی مترنم آواز میں گا رہی تھیں۔

"ممی!" کہتا ہوا ننھا دوڑ کر باجی کے نزدیک پہنچا پھر اس کی نظریں جب باجی کے جھلسے ہوئے چہرے پر پڑیں تو اس نے خوف زدہ ہو کر جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دردناک آواز میں چیخا۔

"یہ میری ممی نہیں ہو سکتیں۔"

"آؤ میرے پاس آؤ۔ میں ہی تمھاری ممی ہوں۔" باجی نے بازو پھیلا دیے۔ ٹمی نے ممی کی آواز پہچان کر آنکھیں کھولیں۔ اب وہ باجی سے چمٹا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔

"تم آ گئے میرے بچے۔" باجی مسکراتے لبوں سے اسے پیار کر رہی تھیں۔

"نغمہ! خدا تجھے تمام عمر خوش رکھے تو نے ممتا کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔"

"ممی! یہ آپ کو کیا ہو گیا۔" ننھا بچہ مریم کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں تھامے روتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں بیٹا مجھے کچھ نہیں ہوا۔" باجی نحیف آواز میں بولیں۔

"آؤ میں تمھیں بتاتی ہوں۔" میں نے ننھے کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نغمہ! تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کے دل میں باپ کے خلاف کوئی بال بھی آئے۔"

حسن بھائی اپنے کیے پر پشیمان اور خاموش ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ شاید پچھتاوے کی چتا میں جل رہے تھے، سلگ رہے تھے، ان کی آنکھیں باجی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ان کی اپنی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

"باجی! حسن بھائی بھی آئے ہیں۔"

"نغمی! تم مجھے کیوں جھوٹی تسلیاں دے رہی ہو۔ جانتی ہو نا؟ کہ میں دیکھ نہیں سکتی۔"

میں خوشی سے مر نہ جاتی اگر اعتبار ہوتا

باجی کے مردہ لبوں پر تبسّم تھا۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو موہے پیا ملن کی آس

میرے پاس تو نین بھی نہیں ہیں۔

"جانم! میری اپنی مریم، مجھے معاف کر دو۔ اگرچہ میں معافی کے لائق نہیں ہوں۔" حسن بھائی معافی کی درخواست کر رہے تھے۔

"آؤ مریم! ان حسین لمحوں کو لے کر پھر سے جئیں گے۔"

آخر وہ آ گئے مجھے دینے تسلیاں
آخر ہوا انھیں میرے صدمات کا یقیں

باجی لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کا تمام جسم خوشی سے کانپ رہا تھا۔ انگ انگ سے مسرت پھوٹے جا رہی تھی۔ وہ تنکے کی مانند لرزہ براندام تھیں۔ جلدی سے حسن بھائی نے بڑھ کر انھیں تھام لیا۔ وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے بازوؤں میں جھول گئیں۔ جیسے پل پل ان کی زندگی کی ڈور ٹوٹ رہی ہو۔ سانس اکھڑ گیا۔ جب انھیں بستر پر لٹایا گیا تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

خلافِ توقع زیادہ خوشی بھی موت کا باعث ہوا کرتی ہے یہی کچھ باجی کے ساتھ بھی ہوا غالباً باجی کو شادیٔ مرگ ہوا اور یہی مسرت جان لیوا ثابت ہوئی۔ ہماری آہ و بکا میں سب

سے زیادہ نالہ وفغاں ٹمی اور حسن کا تھا۔ وہ پاگلوں کی مانند دیواروں سے ٹکریں مار رہے تھے۔
حسن کی اس دیوانگی کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکلا:

کوئی ایسی سحر کو کیا کرتا
بجھ رہے تھے چراغ محفل کے

جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ندیم تولیہ سے منہ پونچھتے اور سریلی آواز میں گنگناتے ہوئے غسل خانے سے باہر نکلے تو اچانک کسی سے ٹکر ہو گئی۔

''اندھے ہو کر چلتے ہیں، سر بھنا کر رہ گیا'' عذرا خفگی کے ساتھ بولی اور اپنی پیشانی کو سہلانے لگی۔

''اچھا تو جناب ہیں۔ میں بھی حیران تھا کہ میری عدم موجودگی میں کمرے میں یہ سنگی ستون کس نے کھڑا کر دیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے اور بڑی بے تکلفی سے تولیہ عذرا کے سر پر ڈال دیا۔ اس نے جھنجھلا کر تولیہ پرے پھینک دیا اور غصیلی آواز میں بولی۔

''ایک تو پیشانی پھوڑ کے رکھ دی اوپر سے بدبودار تولیہ کا مذاق! چند لفظ معافی کے بھی منہ سے نہ پھوٹ سکے۔''

''آپ کے ماتھے سے خون نکلتا تو تب ہم معافی کا سوچتے بھی، اب اس ذرا سی بات پر آپ سے درخواست عفو کر کے اپنی زبان کو کیوں آلودہ کریں؟'' پھر عذرا کا بغور سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ''آخاہ! یہ عنابی ساڑھی، یہ خوب صورت بالوں کا اسٹائل، جوڑے

میں گلاب کے پھول، بڑے ٹھاٹ باٹھ ہیں کہاں جا رہی ہیں؟''

''جہنم میں'' غصے سے تنی بھنوئیں اور بھی سکڑ گئیں۔

''بڑا مبارک خیال ہے خدا توفیق دے مگر اتنا طویل سفر بغیر ساتھی کے کاٹنا دُشوار ہے۔راہیں بڑی پُر خار ہیں اگر بار خاطر نہ گزرے تو میں وہاں چھوڑ آؤں'' ندیم نے حتی الامکان اپنے آپ کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا اور عذرا کے پری وش لبوں پر کلیوں کا سا معصوم تبسم پھیل گیا۔''ندیم بھائی! میں گارڈن ٹاؤن جانا چاہتی ہوں شوفر تو انکل کے ساتھ گیا ہوا ہے۔''

''تو کیا جہنم میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔'' وہ معصوم سی صورت بنا کر بولا۔

''خیر مذاق چھوڑیے۔ پہنچا آئیں گے نامسرت کے ہاں۔''

''یہ مسرت وہی تو نہیں ہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار رونے کو دل چاہتا ہے۔''

''باتوں میں الجھا کر وقت ٹالنا تو کوئی آپ سے سیکھے!''

''آئی ہوئی بلا کب ٹل سکتی ہے۔مگر تم تو ملتے ہی جنگ پر تل گئی ہو ایک فرحت بھی تو ہیں جنھوں نے میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی آہ! وہ حسین لمحات، وہ پُر کشش چاندنی راتیں، ندیا کنارے موسم کی رنگینیاں اور فرحت کا لہک لہک کر شعر پڑھنا ابھی تک نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں وہ تمام منظر۔'' ندیم کی آنکھوں میں دل کش چمک تھی۔

''کیسی ہیں باجی فرحت؟'' عذرا نے پوچھا۔

''تم سے تو بہت زیادہ حسین نکل آئی ہیں، ذہانت میں بھی تم سے دو قدم آگے ہی ہیں۔ایم اے فاضل کر رہی ہیں ان کی خوب صورتی اور ذہانت تو ہمارے خاندان میں لاثانی ہے، دیکھ لینا وہ ہمارے خاندان کا نام روشن کریں گی۔ایک تم ہو کہ ابھی تک ایف اے میں لڑھک رہی ہو۔''

''شکر ہے آپ کو باجی پسند تو آئیں۔'' عذرا دھیرے سے مسکرا کر بولی۔''خیر اب مجھے چھوڑ تو آئیں سچ بہت دیر ہو رہی ہے پارٹی میں سب لوگ پہنچ گئے ہوں گے۔''

''لیکن عذرا! میرے سر میں شدید درد ہے دماغ پھٹا جا رہا ہے پورے پچاس میل کا سفر کر کے آنا کوئی مذاق نہیں۔'' ندیم یہ کہہ کر بڑے مزے سے پلنگ پر دراز ہو گیا۔

''ذرا سر دبا دو تمھارے ہاتھوں کے لمس سے بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔'' وہ خوشامدی انداز میں بولے۔

''عذر لنگ کیوں پیش کر رہے ہیں صاف انکار کیوں نہیں کر دیتے۔''

''یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔ سچ مچ درد سے میرا دماغی توازن ختم ہو رہا ہے۔''

''اچھا اچھا واپسی پر یا صبح کو دبا دوں گی اس وقت تو چلیے۔'' ''تم بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی شریر ہو، درد اب ہو رہا ہے اور دبانا کل پر ملتوی۔تم خود کار چلانا کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔ فرحت تو اتنی اچھی ڈرائیو کرتی ہیں کہ آدمی تو بس ان کے ڈرائیونگ ہی کے انداز پر قربان ہو جائے۔''

''مجھے قتلِ عام کرنا مقصود نہیں۔'' عذرا بولی، بہانے تراشنا تو آپ کی دیرینہ عادت ہے۔''

''کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔'' وہ بڑے اُداس لہجہ میں بولے۔

''سچ ہو تو بات بنے بھی، کبھی جھوٹ بھی پروان چڑھا ہے؟'' عذرا نے کہا اور روٹھ کر باہر چلی گئی۔

ندیم کو علم تھا کہ وہ دادرسی کے لیے ممی کے پاس جائے گی۔لہٰذا اس نے جلدی سے بالوں کو سنوارا آنکھوں پر چشمہ لگایا اور ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے باہر والے دروازے سے نکل کر کار کے قریب یوں کھڑا ہو گیا کہ جیسے پہلے ہی سے کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ممی اور عذرا کو ادھر آتے ہوئے دیکھ کر ندیم نے بڑی چابک دستی سے جھوٹ بولا۔''ممی! کمال کر دیا ہے اس عذرا کی بچی نے، میں گھنٹہ بھر سے اس کا منتظر کھڑا مفت میں ٹانگیں توڑ رہا ہوں۔ ادھر شہزادی صاحبہ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' ممی نے حیرت و تعجب کی نگاہوں سے گھوم کر عذرا کی جانب دیکھا۔

''آنٹی! میں کیا کہوں ندیم بھائی کے جھوٹ بولنے کی عادت تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔'' عذرا نے کہا۔

''ممی! اس چڑیل کو منع کریں کہ مجھے نادم نہ کہا کرے ورنہ میں...'' ندیم غصے میں تھا۔

''بیٹا! تم نے بھی تو اس کے بیسیوں نام رکھ چھوڑے ہیں۔ اگر یہ نادم کہہ دیتی ہے

تو اس میں کون سی قباحت ہے چڑیل سے تو برا نہیں۔'' ممی نے جواب دیا اور عذرا ہنس پڑی۔

ندیم نے دانت پیستے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کار اسٹارٹ کر کے چلتے بنے۔ عذرا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی آنٹی کی جانب دیکھا۔

''آ لینے دو اس کے بابا کو پھر دیکھنا کیا گت بنواتی ہوں اس بدتمیز کی بڑا ہی متلون مزاج ہو گیا ہے وہ میرے غصے کو تو جیسے گھول کر کے ہی پی جاتا ہے۔'' ممی خفگی سے بڑبڑا رہی تھیں اور عذرا کو رونا آ رہا تھا۔

عذرا صغیر سنی میں ہی ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی تھی اس نے آنکھ کھولتے ہی چچی اور چچا کی آغوشِ محبت کو اپنے لیے وا پایا تھا۔ وہ چچا اور چچی ہی کو اپنا ماں باپ تصور کرتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اس پر جان چھڑکتے تھے۔

ندیم شوخ و شنگ اور باغ و بہار شخصیت کا مالک اور ایم اے کا طالب علم تھا جہاں اس کے قدم پہنچتے وہیں نت نئے ہنگامے اور شکایتیں شروع ہو جاتیں۔ افسردگی کے عالم میں بھی قہقہوں کا طوفان اُبل پڑتا، بے جان چیزوں میں زندگی کے آثار پھوٹنے لگتے اس کی شوخیوں کا سب سے زیادہ نشانہ بے چاری عذرا بنتی تھی۔ ندیم کی حد سے زیادہ شرارتوں سے تنگ آ کر عذرا اس کی ممی سے شکایت کر دیتی اور یوں ندیم کو اچھی خاصی ڈانٹ پڑ جاتی تھی مگر ندیم بھی چکنا گھڑا تھا وہ ڈانٹ پھٹکار کو اس طرح خوش ہو ہو کر سنتا جیسے صلواتیں نہیں کوئی دلچسپ الف لیلیٰ کی کہانی سن رہا ہے۔

ایک شام برآمدے میں ندیم تیار ہو کر ہاتھ میں ریکٹ پکڑے ستون کے سہارے یوں کھڑا تھا کہ جیسے کسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہو۔ متجسس نظریں بار بار چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

سامنے کے کمرے سے عذرا باہر نکلی۔ حسبِ معمول سادہ اور صاف ستھرا لباس پہنے تھی۔ اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھیں اس کے روشن چہرے پر بہت ہی خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ندیم نے نیم وا نگاہوں سے عذرا کی طرف دیکھا اور پھر منہ بنا کر ریکٹ کے ساتھ کھیلنے لگے۔

''میرے ساتھ کھیلو گی۔''

''نہیں! آپ چیٹنگ بہت کرتے ہیں۔'' وہ قریب آ کر بولی۔

بجائے جواب دینے کے وہی ریکٹ اس زور سے بھنا کر عذرا کی طرف پھینکا کہ اگر وہ ستون کی اوٹ میں نہ ہو جاتی تو یقیناً یہ ریکٹ اس کے سر سے ٹکرا جاتا۔

عذرا نے ششدر ہو کر ان کی جانب دیکھا اور چپکے سے آنٹی کے پاس چلی گئی۔

آنٹی پام کے پودوں کے قریب کرسی لگائے سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔ ان کے ساتھ بوا گلشن بیٹھی تھیں اور یہ دونوں اپنی ہمسائی کے کسی قصے کے بارے میں بحث کر رہی تھیں۔ ان کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر عذرا خاموشی سے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ندیم بھی ادھر آ گیا۔

''ممی! آپ سارے کام خود کرتی رہتی ہیں ذرا اس بے کار بی بی سے بھی کام لے لیا کریں۔''

''ارے بیٹا! عذرا بے چاری سے کیا کام لوں تمام دن تو وہ کالج میں مغز ماری کرتی رہتی ہے گھر پر اسے ان دھندوں میں جوت دوں تو یہ پڑھے گی کیا خاک؟'' ممی نے جواب دیا اور اس جواب پر عذرا نے بڑے فخر سے ندیم کی طرف دیکھا۔

''ممی!'' وہ بڑے بوڑھوں کی مانند انھیں سمجھانے لگا۔ ''لڑکی تو پرایا دھن ہوتی ہے ہے نا۔ اسے امور خانہ داری سے حتیٰ المقدور واقف ہونا چاہیے۔''

''لوگوں کی لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہوں گی مگر میری عذرا تو ان امور سے مستثنیٰ ہے۔'' ممی نے معنی خیز تبسم سے کہا۔

''بس سر پر چڑھا لیجیے اسے۔'' ندیم نے اپنے خوب صورت چہرے کو بگاڑتے ہوئے کہا، ''آپ کیوں جل کر شامی کباب ہوئے جا رہے ہیں یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔'' عذرا اٹھلا کر بولی۔

''اونہہ! یہ کیا واہیات ہے۔'' ندیم غرایا۔ ''بہت غلاظت ہوتی ہے ان بڑے بڑے نوکیلے ناخنوں میں، وحشی درندوں کی مانند پنجے بنانا، بھلا یہ بھی کوئی فیشن ہے میرا تو دل متلانے لگتا ہے گھن آتی ہے یہ سب کچھ دیکھ کر۔'' ندیم کی نظریں عذرا کی مخروطی خوب صورت انگلیوں

کے بڑھے ہوئے ناخنوں پر تھیں۔

ممی فوراً بولیں، ''ہاں بیٹی! یہ لمبے ناخن تو نحوست کی جڑ ہوتے ہیں انھیں کاٹ ڈالو۔''

ندیم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''شکر ہے ممی نے کچھ تو میرا ساتھ دیا۔'' ''نہیں آنٹی یہ ناممکن ہے۔ مجھے ان ناخنوں سے محبت ہے۔ پھر بھلا میں کیوں انھیں تراشوں؟''

''اچھا جی! انھوں نے بڑے زور سے کہا، جیسے وہ الٹی میٹم دے رہے ہوں اور ایسی شوخ نظروں سے عذرا کو گھورا کہ اسے مجبوراً منہ دوسری طرف کرنا پڑا۔

''بیٹا! صبح ناشتے کی میز پر تمھارے ابا نے تمھارے سپرد جو کام کیا تھا وہ کرلیا ہے یا حسبِ معمول اسے ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' ممی کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔

''ابھی کہاں!۔''

ندیم افسردہ سی آواز میں بولا۔ دیکھیے ممی! وہ میرے دوست رضوی صاحب ہیں نا۔ ان کی بیوی کی شادی کے سلسلے میں ہم باراتی بن کر گئے تھے۔'' وہ مسکرائے بغیر بولا۔

''انکل نے آتے ہی فائل طلب کی تو جناب کو روز روشن میں بھی تارے نظر آجائیں گے پھر اپنے دوست کی بیوی کی شادی میں جانا بھول جاؤ گے۔'' عذرا مسکرا کر بولی۔

''آنٹی منور کے آنگن میں چاند دیکھ آنے کے بعد اب ستاروں کی گنجائش نہیں رہی۔'' ندیم نے سنجیدگی سے کہا۔

''بیٹا! تم نے اپنی خالہ کے حالات ہی نہیں بتائے۔ وہاں کیا کیا خاطریں ہوئی تھیں؟ فرحت تو ماشاءاللہ اب بڑی ہوگئی ہوگی۔''

''بڑی عجیب بات ہے یہی باتیں آنٹی منور نے بھی آپ کے بارے میں پوچھی تھیں۔ ہماری خاطر مدارات تو میں یہاں سے زیادہ بہتر طور پر آنٹی منور کے گھر ہوتی رہی ہیں۔ اگر ہمیں مولا بخش کا ڈر نہ ہوتا تو وہیں کے ہو رہتے۔ فرحت کا قد اتنا لمبا ہوگیا ہے کہ شتر مرغ کی صاحب زادی دکھائی دیتی ہیں۔'' ندیم اپنی ازلی شوخیٔ طبع سے بولا۔

''پچھلے دنوں آپا نے فرحت کی تصویر بھیجی تھی اس میں تو بڑی پیاری لگ رہی تھی۔''

ممی نے کہا۔

''یہ سب کیسے یقین کرلوں۔ جب کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں اور اتنی بڑی لڑکی کیمرہ میں کیسے سما سکتی ہے۔ بھئی تعجب ہے۔''

عذرا ٹوکری سے ٹماٹر اٹھا کر چھری سے کاٹنے لگی ''کیا خیال ہے تمھارے لیے فرحت کو بیاہ لاؤں۔'' ممی نے مسکرا کر پوچھا۔

ندیم کا چہرہ ایک دم سرخ سا ہوگیا اور کانوں کی لوؤں سے خون ٹپکنے لگا اور منہ بنا کر عذرا کے ہاتھ سے ٹماٹر چھین کر کھانے لگا۔

''خدا کرے یہ ٹماٹر پیٹ میں جاتے ہی چوہا بن کر کھلبلی مچانے لگے۔ عذرا کوسنے لگی۔

''چلیے سستے چھوٹے۔ اگر یہی ٹماٹر پیٹ میں ہاتھی، اونٹ بن جاتا تو میرے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔'' وہ بڑے مزے سے بولا۔

یہ نوک جھونک جاری تھی کہ اس اثنا میں ندیم کے ابا آ گئے اور ندیم سے مخاطب ہو کر وقار اور رعب سے پوچھنے لگے، ''ندیم! تم نے رجسٹر میں رسیدات اور واؤچر وغیرہ کا اندراج کرلیا ہے۔''

ندیم، ابا حضور کے انداز دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا تھا اور اب اِس سے بات بنائے نہ بن رہی تھی۔ اسی لیے اس کے منہ سے صرف یہ نکل سکا۔

''جی... جی... ہاں۔'' اس وقت ندیم اپنی تمام شرارتیں اور چوکڑیاں بھول چکا تھا اور اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

عین اسی وقت عذرا کو بڑے زور سے کھانسی اُٹھی جو ندیم کو ناگوار گزری۔

''گلے میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا ہے کیا؟'' ندیم نے دبی دبی زبان اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''شاباش! تم نے بہت اچھا کیا اب وہ رجسٹر منیجر کے سپرد کر آؤ۔'' ابا حضور نے فرمایا۔ ندیم واقعی سٹپٹا گیا اور بوکھلاہٹ میں اپنے کمرے کی جانب لپکا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بہار کا موسم ہونے کی وجہ سے پھولوں کی خوش بو سے مہکتی ہوائیں شاہ بلوط کی چوٹی کو چوم کر گزر رہی تھیں۔ گلاب کی ڈالی پر بیٹھی بلبل کی دردناک لے سے پھولوں کا سینہ شق ہو رہا تھا۔ پتوں کی سرسراہٹ خاموش فضا میں رچ بس چکی تھی۔ ندیم کو

جب یہ اطمینان ہو گیا کہ سب سو رہے ہیں تو وہ چپکے سے اٹھے اور دبے قدموں چلتے ہوئے عذرا کے کمرے میں آئے۔ اس کا کمرہ خوب صورت اور قیمتی چیزوں سے آراستہ وپیراستہ تھا۔ میٹل پیس پر رکھے گل دانوں میں سے بھینی بھینی سی خوش بو نکل کر تمام کمرے کو معطر کر رہی تھی کمرے کی نفاست اور سجاوٹ عذرا کے عمدہ ذوق کی عکاس تھی۔ عذرا بے خبر نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا۔ قریب ہی فرش پر میگزین پڑا تھا جس کے ورق ہوا سے پھڑ پھڑا کر اِدھر اُدھر اُڑنے کی کوشش کر رہے تھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پڑھتے پڑھتے سو گئی ہے۔ ندیم نے عذرا کے چہرے کی طرف دیکھا وہ سوتی نظر آئی پھر ندیم نے اپنے پاؤں کو زور سے فرش پر مارا یہ تسلی کرنے کے لیے کہ عذرا واقعی سو رہی ہے۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ وہ گہری نیند میں ہے اور آہٹ پر نہیں جاگے گی تو خاموشی سے پلنگ کے قریب فرش پر پنجوں کے بل اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں نیل کٹر تھا آنکھوں میں دنیا جہاں کی شرارتیں چمک رہی تھیں اور ہونٹ ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے تھرک رہے تھے۔ اس نے بڑی سرعت سے عذرا کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن کاٹ لیا اور پھر اس کے چہرے کی جانب دیکھا وہاں کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ ندیم اپنی اس کامیابی پر مسکرایا اور پھر شہادت والی انگلی کو چھوڑ کر درمیان والی انگلی کا ناخن کاٹ لیا وہ اب بھی بے خبر سو رہی تھی چہرے پر اسی طرح فرشتوں جیسا تقدس اور لبوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔ جس وقت چھنگلیا کا ناخن کترا تو ساتھ ہی انگلی کا تھوڑا سا گوشت بھی کٹ گیا۔ وہ یک دم کرب سے چیخ اٹھی۔ ندیم جلدی سے پلنگ کے نیچے گھس گیا۔

''ہائے اللہ میں مر گئی۔ میری چھنگلیا کو کسی موذی چوہے نے کاٹ کھایا۔'' عذرا تکلیف سے بلک رہی تھی۔ خون کے قطرے فرش کو داغ دار کر رہے تھے۔

ندیم کی نظر جب خون کے ان دھبوں پر پڑی تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گیا۔ اسے اگر ذرا سی بھی پھانسی لگ جاتی تھی تو وہ درد سے کراہنے لگتا تھا۔ چناں چہ عذرا کی انگلی سے نکلتا ہوا خون دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل بھاگا۔

عذرا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کی انگلی پر نظر ڈالی۔ وہ

سمجھ گئی کہ یہ حرکت ندیم کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی، ''نادم بھائی! کیا واقعی آپ میرے وجود سے اتنے متنفر ہو چکے ہیں۔'' عذرا کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ رقت آمیز انداز میں میں رونے لگی۔ ندیم کمرے میں آیا اس نے کہا۔

''عذرا!'' ندیم نے بے چینی سے اس کا زخمی ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بڑی نرمی سے تھام لیا۔'' خدارا! مجھے معاف کر دو میری اچھی بہن... میری ہمدم... ننھی عذرا... معاف... کر دو گی نا؟'' وہ گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔

''کر دیا نا معاف؟''

''ہاں۔'' عذرا کے کپکپاتے لبوں سے نکلا۔ اس کے خوب صورت رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے اس طرح چمک رہے تھے کہ جیسے گلاب کے پھول پر شبنم چمکتی ہے۔

ندیم نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، ''عذرا! اب نہ رونا تمھاری آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی گرتا ہے تو میرے دل میں سوراخ کرتا چلا جاتا ہے۔'' وہ اداکاری کر رہا تھا۔ عذرا ٹشو پیپر سے خون آلود انگلی صاف کرنے لگی تو ندیم بولا... ''ٹھہرو۔ میں ابھی اسے دھو کر پٹی باندھ دیتا ہوں۔'' وہ بھاگ کر اپنے کمرے سے فرسٹ ایڈ کا ڈبہ لے آیا اس نے بڑی ہمدردی سے عذرا کے ہاتھ کو لوشن سے صاف کیا اور ایک ماہر ڈاکٹر کی مانند بڑی صفائی اور چابک دستی سے پٹی باندھنے لگا۔ عذرا حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے اس کی ہمدردی کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ پٹی باندھ چکا تو عذرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''اس کا ذکر...!''

''کسی سے نہ کروں گی۔'' آپ مطمئن رہیں۔

''اوہو! تم کتنی سعادت مند بچی ہو۔ شام کو تمھارے لیے بازار سے بہت سارے کھلونے خرید کر لاؤں گا۔'' وہ شرارت سے بولا۔ عذرا کی ہنسی نکلی۔ درد کی شدت موجود تھی لیکن وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

عذرا دوپہر سے منہ پھلائے ہوئے تھی۔ اس کو اپنے ناخنوں کے کٹنے کا غم تھا۔ وہ جہاں ندیم کو دیکھتی پہلو بچا کر گزر جاتی اور حتی الامکان کوشش کرتی کہ ندیم کا سامنا نہ ہو۔ ندیم

کو بھلا کب چین تھا کسی نہ کسی طریقہ سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے اس سے کنی کترا جاتی تھی۔

"یہ تم پھول کر کُپّا کیوں بنی رہتی ہو۔" ندیم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے مقابل کھڑا کر دیا۔ "چہرے سے سنجیدگی کا نقاب اُتار دو۔" اس نے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ عذرا نے غصے سے ندیم کا ہاتھ جھٹک کر اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"تم میرے خوب صورت ناخنوں کے قاتل ہو میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی بلکہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" عذرا غصہ سے لال پیلی ہو کر بولی۔

"ٹوٹ کر؟" ندیم نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ دبے دبے لبوں پر شریر سی مسکان تھی۔

"کہیں سے بھی ٹوٹی پھوٹی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہو۔ اسی طرح ہٹی کٹی ہو۔ نفرت کرتی ہو مجھ جیسے حسین و جمیل ہینڈسم انسان سے، جی چاہتا ہے کہ ابھی اسی وقت پستول سے تمھیں شوٹ کر دوں۔ یہ تمھارا دماغ جس میں نفرت کا بھوسہ بھرا ہوا ہے بھک سے اُڑا دوں گا اور یہ جو تم اکڑ کر چلتی ہو کس بل نکال دوں گا۔ سمجھی تم۔" ندیم غصہ سے بولا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ عذرا خوف سے سہم گئی۔ چہرے کا رنگ ڈر کے مارے سفید ہو گیا دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ سرپھرا انسان ہے کچھ بھی کر سکتا ہے بدلتے موسم کی طرح اس کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے۔ عذرا دُکھی دُکھی مجروح نظروں سے اپنے دفاع کے لیے اِدھر اُدھر جائے پناہ تلاش کرنے لگی۔

ندیم کا ہاتھ کافی دیر تک جیب میں گم رہا "کہاں گیا کم بخت! ابھی تو یہاں تھا۔ مل گیا۔" اس نے خوشی سے نعرہ مارا اور جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو ہاتھ میں خلال تھا وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اب مطلع چھٹ گیا تھا۔

"اوہ، اچھا! دانت نکال رہی ہو۔ آج تو ٹوتھ پکس کی وجہ سے بچ گئی ہو۔ آئندہ نفرت کا نام لیا تو خنجر سے گھائل کر دونگا۔ سمجھی تم۔"

"میں دیکھ لوں گی تم کتنے پانی میں ہو۔" وہ بھی شکست ماننے والی نہیں تھی۔

"اور میں بھی تمھیں دیکھ لوں گا کہ تم کتنے صحرا میں ہو۔ نک چڑھی بل بتوری۔"

ندیم نے عذرا کی چٹیا پکڑ کر ایک دو بل دے ڈالے۔ عذرا کا سر پیچھے کو جھکا اور درد شروع ہو گیا اس کا من رو دینے کو چاہا۔

"تم رونا مت تمھاری بگڑی ہوئی بندریا جیسی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آتی ہے۔ نہ جانے کیوں عورتیں آنسوؤں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں یہ جو تمھاری آنکھوں میں کسی آنے والے طوفان کا خطرہ جھلک رہا ہے میں ان سے خائف ہونے والا نہیں ہوں۔" ندیم کی آنکھوں سے گویا شعلے لپک رہے تھے۔

"مت ڈرو ہٹلر صاحب! میری نفرت کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھی جاتی ہے۔" عذرا یہ کہہ کر پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

ندیم پریشان ہو گیا۔ جانے ان جانے میں یہ کیا ہو جاتا ہے ایک چھوٹی سی شرارت چنگاری بن جاتی ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اسے پچھتاوے کی کسک اتنا تنگ کرے گی۔ مگر نہ جانے کیوں جب اس کا عذرا سے سامنا ہو جاتا تو وہ پھر جنگ کا محاذ بنا ڈالتا۔ یوں تابڑتوڑ حملے شروع ہو جاتے۔ ندیم سوچنے لگا، "میں کتنا بیوقوف ہوں جس کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں اسے تختۂ مشق بنا رہا ہوں مگر میں کیا کروں؟ وہ منھ بسورتی ہوئی مجھے خوب صورت لگتی ہے۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو کر کِھلے ہوئے گلاب کی طرح لگتا ہے۔ گالوں کے چھوٹے چھوٹے ڈمپل اور بھی گہرے ہو کر خوب صورت ہو جاتے ہیں۔"

عذرا کمرے سے باہر نکلنے لگی تو ندیم نے اس کا راستہ روک لیا "اب غصہ تھوک دو۔"

"کس پہ۔"

"اب ناراضگی چھوڑ دو۔ معذرت چاہتا ہوں۔ کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں۔"

"ضرور ابھی اسی وقت۔" عذرا کے چہرے پر مسکان تھی۔ اس کی مقناطیسی آنکھوں میں نشہ اور بھی نشیلا ہو گیا۔

"اس وقت تو دن نکلا ہوا ہے کیا کروں۔" وہ بڑی مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"حاتم طائی صاحب! اچھا تو سورج ہی توڑ لائیں۔" وہ بولی۔

"سورج! قیامت آ جائے گی قیامت۔" وہ سر کھجلاتے ہوئے بولا۔

"قلابے ملاتے ہیں آسمانوں کے اور باتیں کرتے ہیں قیامت کی۔" وہ بولی۔

"پھر کیا کروں تمھارے قدموں میں پھول بچھاؤں یا پلکیں۔" ندیم نے کہا۔

"اگر بچھا سکو تو پلکیں بچھاؤ کیوں کہ یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔" عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہو بُرے پھنسے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر شریری مسکراہٹ سے بولا۔

"پھر ٹھیک ہے ناراضگی دور نہیں ہو سکتی نادم بھائی۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"دیکھتا ہوں اس روٹھنے کی اُڑان کہاں تک جاتی ہے۔" وہ قدرے اونچی آواز سے بولا۔

"یہ اُڑان فلک کو چھو لے گی۔ میرا راستہ چھوڑو۔" وہ خفگی سے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اللہ رے ان کا غصہ، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ کیوں کر کوئی جیے گا جب یوں عتاب ہو گا۔ ندیم کی آواز نے اس کا تعاقب کیا لیکن اس نے مڑ کر بھی دیکھنا گوارہ نہ کیا۔

ندیم ذہنی انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ اسے خیالات کی یلغار نے بہت تنگ کر رکھا تھا دل کا طوفان تھم نہیں رہا تھا۔ من میں ایک کسک سی کھٹکتی تھی۔ دو دن سے وہ انتہائی پریشان اور بوکھلایا بوکھلایا سا تھا۔ کیوں کہ عذرا ابھی تک ناراض تھی وہ کسی طور مان کر نہیں دے رہی تھی۔

موسم بہار اپنے جوبن پر تھا ہر طرف رنگ، خوش بو، اور خوش نما پھول نظر آ رہے تھے۔ بہار کی سب سے حسین سوغات پھول ہیں پھولوں کو دیکھتے ہی فرحت سکون اور تازگی کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ اپنے کمرے میں دریچہ کے پاس کھڑا تازہ ہوا کے معطر جھونکوں میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ سامنے گلاب کی کیاری میں اس نے عذرا کو دیکھا جو خوب صورت لباس زیب تن کیے تتلیوں کو جال میں پھانسنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ بڑی معصوم سی پری لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے جوڑے میں گلاب لگائے ہوئے تھے۔

ندیم کھڑکی سے نیچے کود کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ہر جگہ چراغ کے جن کی طرح پلک جھپکتے ہی نمودار ہو جاتے ہو۔" عذرا دیکھے بغیر لاپروائی سے بولی۔

"میں ایسا خودرو پودا ہوں کہ جو جگہ پسند آ جائے وہیں سر نکال لیتا ہوں۔"

"اچھا پودا صاحب! اب سر نکال لیا ہے۔ لہٰذا تشریف کا ٹوکرا لے جائیے۔" وہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔

"میں اگر پھول ہوں تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو" ندیم نے اس کے کالے بالوں میں سجے پھولوں کو چھو کر کہا۔

"تا کہ میرے سر میں کانٹا بن کر کھٹکتے رہو۔" عذرا نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عذرا کی خوب صورت آنکھوں کے خمار اور جاذبیت نے ندیم پر طلسم سا کر دیا اور پھر اس کے دل میں ایک دھما کہ سا ہوا وہ گھبرا گیا۔

اپنی مقناطیسی آنکھیں نیچی کرو خواہ مخواہ ڈورے ڈال رہی ہو" وہ یکا یک جھنجھلا کر بولا۔

مجھے کوئی شوق نہیں تم پر کمند ڈالنے کا اور نہ ہی میں مقناطیس ہوں جو تم جیسے لوہے کو کھینچ لوں۔" عذرا نے جواب دیا۔

"تم مجھے پسند نہ کرو مگر میں تمھارے دل میں درد بن کر رہوں گا۔

"درد کے سوا تم دے بھی کیا سکتے ہو۔"

"دیکھو عذرا مسلمان بھائی آپس میں تین دن سے زیادہ غصہ نہیں کرتے۔"

وہ سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اوّل تو میں بھائی نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ ابھی تین دن نہیں ہوئے نادم بھائی" عذرا نے یہ کہا اور تتلیاں پکڑنے والا جال ندیم کے منہ پر پھینکا اور چلتی بنی۔ صورت حال پیچیدہ ہو گئی۔

"اب میں تمھیں کبھی نہیں مناؤں گا۔ دیکھنا میں تمھارا کیا حشر کرتا ہوں۔ تمھاری زندگی اتنی پریشان کر دوں گا کہ تم ان سے لڑتی لڑتی تھک جاؤ گی۔ بڑی آئی افلاطون کی نانی۔" ندیم کسی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

گھر میں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ ندیم کو بچپن ہی سے گھر میں بہت زیادہ لاڈ پیار ملا تھا اس لیے وہ کسی حد تک خودسر بن گیا تھا۔ ہر بات میں من مانی کرنے والا خودسر اور خود پسند دوسروں سے خود خواہ کتنا ہی مذاق کر لے مگر جب دوسرے اسے مذاق کا نشانہ بناتے تھے تو وہ مذاق ندیم کی قوتِ برداشت سے باہر ہو جاتا تھا اور وہ اس مذاق کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے انا کا مسئلہ بنا لیتا اور ایک طوفان کھڑا کر دیا کرتا تھا۔

☆

آج بنگلے میں ہنگامہ سا برپا تھا۔ ندیم بوکھلائے انداز میں دوڑتا پھر رہا تھا اس کی گھبراہٹ قابلِ دید تھی۔

''ممی! ڈرائنگ روم میں جو صوفہ سیٹ ہیں ان کی ترتیب ٹھیک نہیں... کھانے کا خاص اہتمام کیا جائے... مہمانوں کے لیے جو کمرہ مخصوص کیا گیا ہے... اسے خوب آراستہ کیا جائے... یہ عذرا کہاں چلی گئی ہے؟... جی کیا کہا... مسرت کے ہاں۔ بڑی مصیبت ہے، اسے آج ہی اپنی سہیلی کے ہاں جانا کیوں یاد آیا؟... جی مسرت بیمار ہے۔ عذرا کون سی ایسی مسیحا ہے جو اسے تندرست کر دے گی۔ ممی! بھلا آپ اکیلی کیا کیا کریں گی یہ تو بڑی مشکل درپیش ہے نوکر بھی ایک سے ایک بڑھ کر کام چور ہیں۔''

بے چارے ملازموں کی علاحدہ شامت آئی ہوتی تھی۔

''اُف! توبہ ہے لڑکے۔ خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں پھلائے جا رہے ہو۔'' ممی بولیں۔

''ممی! خدا کے واسطے ذرا جلدی تیاری مکمل کر لیں۔ میں غسل کے لیے جا رہا ہوں۔ بس گاڑی آنے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔'' ندیم تولیہ لے کر غسل خانے میں گھس گیا۔

اس اثنا میں عذرا، مسرت کے ہاں سے واپس آئی اور سیدھی ممی کے پاس آ گئی۔ ممی کے کمرے میں ہی ندیم قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا بالوں کو سنوارتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

میں گُل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں راستہ پر

وہ اپنی ترنگ میں اچھے بھلے شعر کو توڑ مروڑ کر گنگنا رہا تھا۔

''آنٹی! یہ کس خوش نصیب کی آمد پر اتنا شان دار اہتمام ہو رہا ہے؟ جب میں

یہاں سے گئی تھی تو مکمل سکون تھا واپس آئی تو ہر طرف رونقیں نظر آ رہی ہیں۔ پورے بنگلے میں ایک طوفان سا برپا ہے۔'' عذرا نے ممی کو مخاطب کرتے ہوئے دل فریب مسکراہٹ سے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں عذرا! ابھی ابھی ان کی آمد کا فون آیا ہے۔'' ندیم ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے بولا وہ عذرا کے ساتھ تمام اختلاف بھول چکا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک دمک رہا تھا۔

''آخر کون آ رہا ہے؟'' عذرا نے بھی براہ راست ندیم کو مخاطب کیا۔

''تم نگہت کو جانتی ہو؟''

''یہ جو گلوں سے نکل کر نسیم سحر کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ہمیں صبح ہی صبح بیدار کر دیتی ہے''۔ وہ لبوں کو بھینچ کر بولی۔

''یہ تم چمن میں کہاں گھس گئیں۔ میں تو صرف فرحت جہاں آرا نگہت کا ذکر کر رہا ہوں۔ جو زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے آ رہی ہے۔''

ندیم نے عذرا کے سر پر ایک چپت جمائی اور کار میں بیٹھ کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ ندیم بڑے خوش گوار موڈ میں تھا۔

گھر میں فرحت کی آمد کے ساتھ ہی گویا گھر کا نقشہ بدل گیا تھا۔ وہ آنٹی کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس سے پہلے آنٹی عذرا پر جی جان سے فدا رہتی تھی مگر اب شاید عذرا کے لاڈ پیار کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ عذرا کو پھانس بھی لگ جاتی تو آنٹی بے چین ہو جاتی تھیں مگر اب آنٹی کی شفقت و محبت کے نقوش دھندلا رہے تھے۔ آنٹی کی بے رُخی سے عذرا کی حالت غیر ہو گئی وہ فرطِ یاس سے گنگ ہو گئی اور وہ ناشتا کیے بغیر ہی کالج چلی جاتی۔ آنٹی کو کبھی خیال تک نہ آتا کہ وہ بھوکی پیاسی ہے۔ وہ تو بس فرحت کی ناز برداری میں لگی رہتیں اور عذرا سوچتی:

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

آنٹی ہر شام مرچیں وار کر فرحت کی نظر اتارتیں۔ جب مرچیں آگ میں جلتیں تو سارا گھر چھینکوں کی زد میں آ جاتا۔

"ہر شام یہ کیا طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے۔" آخر تنگ آ کر ایک روز ابا حضور چھینکتے ہوئے بولے۔

"میں اپنی پیاری سی بچی کی نظر اُتارتی ہوں۔ اس کو کسی کی نظرِ بد نہ لگ جائے۔ آ آ چھیں۔ مرچوں سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔" آنٹی کہہ رہی تھیں اور چھینکوں سے ان کی اپنی ناک بھی لال انگارہ بنی ہوئی تھی۔

"ایک دم جاہلانہ حرکتیں۔ بھلا کیا ان مرچوں سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ آئندہ یہ توہم پرستی ہمارے گھر میں نہ ہو۔" ابا حضور پے در پے چھینکیں مارتے ہوئے غصے سے بولے۔

عذرا لبوں پر ہنسی دبائے ناک پر رومال رکھے اور دوسرے ہاتھ میں ٹشو پیپر کا ڈبہ لیے ابا حضور کے پاس کھڑی تھی۔ وہ بار بار ناک سے بہتے ہوئے پانی کو ٹشو سے صاف کر رہے تھے۔ عذرا کی خوب صورت آنکھیں برسات بنی ہوئی تھیں۔ ندیم کی چھینکیں بڑی زناٹے دار تھیں۔

"آ...آ...آ...چھیں!

"جتنی زیادہ چھینکیں آئیں گی۔ اتنی زیادہ بلائیں فرحت سے دُور ہوں گی۔ ہے نا ممی۔" ندیم شرارت سے بولا۔ فرحت کے بدن میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو رہی تھی۔ ناک سے شوں شوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ناک پکوڑا بنی ہوئی تھیں۔ سب کا برا حال تھا یوں لگتا تھا جیسے اس سیلاب میں سارا گھر بہہ جائے گا۔ صورت حال بڑی دردناک ہو رہی تھی۔

ندیم بولے جا رہا تھا۔ "ناک کے ساتھ بہت کچھ لگ سکتا ہے حتیٰ کہ رومال بھی۔"

ندیم، عذرا کی طرف آنکھ مار کر بولا۔ "ممی دیکھیے! فرحت پر کتنا خطرناک لرزہ طاری ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے دہشت ناک جن بھوت اس کا پیچھا چھوڑ رہے ہیں۔ ہے نا کتنی حیرت ناک بات۔" ندیم میں دنیا جہاں کی شرارتیں عود کر آئی تھیں۔

"بکواس بند کر۔ تو نے میرا مذاق بنا ڈالا ہے۔" ممی خفگی سے بولیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمھیں تو مرچوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جس نے آئی ہوئی بلائیں ٹال دیں۔" ابا حضور ہنس کر بولے۔

"آپ بھی نا بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔" ممی غصہ سے اٹھ کر کمرے میں

چلی گئیں۔

"وہ ایک بوری مرچوں کی آئی ہے۔ کیوں نا ساری کی ساری فرحت پر نچھاور کر دیں؟ ندیم شرارت سے کہہ رہا تھا۔

ندیم سدا ہی سے لاپروا تھا۔ بڑی ہی سیلانی طبیعت پائی تھی۔ گھنٹوں فرحت کے ساتھ گپ بازی میں مصروف رہتا۔ پکنک منانے کا پروگرام ہے یا کہیں ساحل سمندر پر سیر و تفریح ہو رہی ہے وہ گویا عذرا کے وجود کو بھول چکا تھا۔ ہاکس بے جا رہے ہیں، کلفٹن اونٹ کی سواری ہو رہی ہے۔ غرضے کہ فرحت کے ساتھ خوب انجوائے کر رہا تھا۔ آئے دن طرح طرح کی محفلیں ہوتیں، لطیفے سنے اور سنائے جاتے، تاش و کیرم کی بازیاں ہوتیں مگر عذرا ان سب سے لاتعلق خاموش شمع محفل کی مانند چپکے چپکے جلتی رہتی تھی۔

عذرا کا ندیم سے ایک مقدس رشتہ ہے بہن بھائی کا، لیکن آج کل وہ دل میں ایک عجیب سی ہلچل محسوس کر رہی تھی اور ہر وقت طرح طرح کے خیالات اسے گھیرے رہتے تھے وہ سوچا کرتی تھی کہ ہمارا رشتہ کس موڑ پر آ گیا ہے۔ دل کی دیوار پر یہ کیسی دستک ہو رہی ہے۔ میٹھی میٹھی کسک، عجیب سی الجھن اور خیالات کی اُڑان نئے آسمان چھونا چاہتی ہے۔ شوخیاں اور چنچل پن نہ جانے کہاں چلا گیا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی اور سہمی سہمی اپنے اردگرد کا جائزہ لیتی لیکن اسے سمجھ نہ آتا کہ اس کے اندر یہ کیسی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ بظاہر تو سمندر کی سطح کی طرح باہر سے پُرسکون مگر نہ جانے کتنے ہی ہول ناک طوفان اندر ہی اندر سر پھوڑ رہے ہیں۔ شوریدہ سر موجیں خرمستیاں کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ایک ہیجان سا برپا تھا۔ ندیم اس کے دل کی دھڑکنوں میں دھیرے دھیرے سماتا جا رہا تھا۔ اس کی زندگی پُرسکون تھی لیکن اب بے چینی و بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ دونوں میں چپقلش جاری تھی عذرا کی خواہش تھی کہ ندیم پھر اس سے بولے، لڑے، مگر وہ تو اس کو مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔ نظریں چرا کر گزر جاتا تھا۔ دونوں میں ختم نہ ہونے والی سرد جنگ چھڑ چکی تھی، فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ عذرا چاہتی تھی کہ ندیم پھر اسے ستائے اور چڑائے، چڑیا نوچے، شٹل کوک کے بہانے آنکھ کو نشانہ بنائے... لیکن وہ تو کسی اور کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا جب وہ ندیم اور

فرحت کو اکٹھا دیکھتی تو دل مسوس کر رہ جاتی۔ من میں ایک ٹیس اٹھتی تھی۔ اسے اپنے اندر اتنی گھٹن محسوس ہوتی کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔

عذرا گھبراہٹ اور پریشانی میں مسرت کے گھر چلی گئی۔ وہاں بھی وہ کھوئی کھوئی سی بے چین اور خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ چہرے کا رنگ زردی مائل ہو رہا تھا۔ بلبل کی طرح ہر وقت چہکنے والی کو اس حالت میں دیکھ کر مسرت بھی پریشان ہو گئی۔

''اے ہے! مینڈک کو بھی زکام ہو گیا ہے۔'' مسرت نے اس کے چٹکی کاٹ کر کہا۔

''کیا بات ہے بڑی بکھری بکھری سی لگ رہی ہو۔ آج بالوں کے گلاب کہاں گئے؟''

عذرا نے نگاہیں اٹھا کر مسرت کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

''ندیم نے کئی دنوں سے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ روز روز کی جنگ سے تمھاری جان چھوٹی۔ دیکھو تو سہی تمھارے حسین ناخنوں کا اس نے کیا حشر کر ڈالا'' مسرت نے اس کے نازک ہاتھ پکڑ کر کہا۔ عذرا نے بے تابی سے مسرت کی گردن میں بازو حمائل کر دیے اور شدت سے بلک بلک کر رو پڑی۔

مسرت مضطرب ہو گئی اور کہنے لگی۔ ''کھل کر رو لو میری جان تا کہ دل کے دکھ درد سب آنسوؤں میں بہہ جائیں۔ غم کے آنسو اگر اندر ہی اندر رہیں تو وہ زہر بن جاتے ہیں۔

مسرت کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ اس نے عذرا کو پانی پلایا۔ ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کیا اور ڈھارس بندھائی تو عذرا کو آہستہ آہستہ سکون ملنے لگا۔

مسرت نے پوچھا۔

''اب بتاؤ بات کیا ہے۔'' عذرا نے اپنے دل کی کیفیت تفصیل سے بیان کی۔

''اچھا تو یہ عشق بھڑکتا ہوا الاؤ بن چکا ہے'' مسرت دل نواز انداز سے مسکرائی۔

''آتش عشق!'' خوابوں میں نہیں! حقیقت میں جیو یار۔ ندیم کو بتا دو۔ آئی لو یو۔''

''نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔'' عذرا گھبرا کر بولی۔

''پھر ٹھیک ہے۔ جلتی رہو شمع کی طرح۔'' مسرت کی اس بات پر عذرا چپ چاپ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''ایسے خوابوں کا کیا فائدہ جو پلکوں ہی میں دم توڑ جائیں۔ جن کی کوئی تعبیر ہی نہ ہو میری جان کچھ بولو دل کا غبار ہلکا کرو۔

''نہیں مسرت ایسا نہیں ہو سکتا۔ جس انسان کو بچپن ہی سے بھائی کے روپ میں دیکھا۔ اس کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار بڑا گناہ ہے۔'' عذرا دکھ سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ پھر خارزاروں پر سفر کرتی رہو پاؤں زخمی ہو جائیں گے دشوار مسافت کبھی ختم نہیں ہوگی منزل تمھیں تلاش کرتی رہ جائے گی۔ اگر کہو تو میں تمھاری مدد کروں۔'' مسرت بولی۔

عذرا نے مسرت سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں کسی کی مرہونِ منّت نہیں ہو سکتی۔ اپنا راستہ بھی ڈھونڈ لوں گی اور منزل بھی۔ جیسا تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تم مانو یا نہ مانو کیوپڈ دیوتا اپنا کام کر گیا ہے''۔ اس کی آنکھوں میں شرارت عود کر آئی اور اس نے عذرا کا چہرہ اوپر کر کے کہا۔

لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

مسرت نے اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کر کے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے۔ جوارش فلسفہ زیادہ مقدار میں چڑھا گئی ہو۔ نہ جانے تم کون سی بھاشا بول رہی ہو۔ تمھاری باتیں میری فہم سے بالاتر ہیں۔'' عذرا تحیر زدہ لہجے میں بولی۔

''کائنات کی وسعتوں میں عشق ہے اور عشق دردِ دل کی دوا ہے۔ عشق خدا کا روپ ہے۔'' مسرت کی رگ شرارت پھڑک رہی تھی۔

''میں تو سکونِ قلب کے لیے تمھارے پاس آئی تھی اور تم میرے دل کو پارہ پارہ کر رہی ہو۔'' عذرا تاسف سے بولی۔

"دیکھ لینا یہ جو تمھاری ڈیوٹی فری امپورٹڈ کزن فرحت صاحبہ ہیں نا۔ تمھارے ندیم کو اُچک کر لے جائے گی۔ گھر مہمان بن کر آئی ہے لیکن گھر کی مالکہ بن جائے گی اور تم کفِ افسوس ملتی رہ جاؤ گی۔ عذرا! ذرا غمِ دوراں سے دامن بچا کے رکھنا ورنہ تمھارے خواب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔"

عذرا نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں ہے ہم جسے چاہیں اسے پانے کی تمنا بھی کریں۔ بے لوث محبت تو قربانی دینے کا نام ہے۔"

"اچھا تو پھر بڑی حوصلہ مندی اور دلیری سے چڑھ جاؤ محبت کی سولی پر۔" مسرت خفا ہو کر بولی۔ میں بھی تو دیکھوں تمھاری قربانی کے یہ جذبے کب تک تمھارا ساتھ دیتے ہیں؟"

راز کو راز ہی رہنے دو۔ اگر پردہ اٹھ گیا تو میں کھائی میں گرتی چلی جاؤں گی۔ میرا عزم بہت بلند ہے۔

رقّت کے مارے عذرا کی آواز لرز رہی تھی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" عذرا کبیدہ نظروں سے مسرت کو دیکھتی ہوئی اٹھی۔

"میرے مشورے پر غور کرنا۔" مسرت نے کہا اور اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

"تم بہت بڑی فلسفہ دان ہو۔ فیثا غورث کی نانی۔" عذرا نے طنزاً کہا اور کار میں بیٹھ کر گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔

بہار کی آمد آمد تھی۔ گل داؤدی، گلاب اور نرگس کے پھول اپنے جوبن پر تھے۔ آسمان پر متوالی گھٹا جھوم جھوم کر برسنے کو تیار تھی، کالے بادلوں کے نیچے سفید بگلوں کی قطار بہت بھلی لگ رہی تھی۔ عذرا اور فرحت لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ نکہت گل سانسوں میں رچ بس گئی۔ دونوں ہی شگفتہ اور خوش گوار موڈ میں تھیں ویلنٹائن ڈے تھا۔ آج تمام گلے شکوے ختم۔ نئے سرے سے زندگی شروع۔ محبت بانٹنے، تحفے بانٹنے مسکراہٹیں بکھیرنے اور ایک دوسرے کو پھول پیش کرنے اور ساتھ مل بیٹھنے کا دن تھا۔

سامنے سے ندیم سیٹی بجاتا ہوا خوش خوش آرہا تھا اس کے ہاتھوں میں گلاب کے

پھولوں سے بنا ہوا خوب صورت سا گل دستہ تھا وہ عذرا کی طرف آنے لگا تو عذرا کا دل مارے خوشی کے اُچھلنے لگا۔ وہی مخصوص دل نواز مسکراہٹ اس کے چہرے پر عود کر آئی۔ آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی گویا تشنۂ تکمیل تمناؤں اور بے تعبیر خوابوں کی تعبیر ملنے والی ہے۔ ایک موہوم سی امید بندھی لیکن ندیم نے نزدیک آکر اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور مسکراتے ہوئے سیدھا فرحت کے پاس جا کر اس کے سامنے زانو ٹیک کر پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا:

رکھنا ہے تو رکھ لیجیے ان پھولوں کو نگاہوں میں
خوش بو تو مسافر ہے کہیں کھو جاتی ہے راہوں میں

ندیم نے آخری مصرع ادا کرتے وقت شرارت سے عذرا کی طرف دیکھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے چڑا رہا تھا۔ عذرا کو ندیم سے اس قدر بے اعتنائی کی امید نہ تھی۔ اس کے ارمانوں پر اوس سی پڑ گئی، نازک جذبات مجروح ہوگئے اور اس کی پلکوں میں پھر سے طوفان ہلکورے کھانے لگا۔

"آپ کے پھولوں کا نایاب تحفہ ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔" فرحت دل افروز انداز سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرا تو جی چاہتا ہے تمھارا آنگن پھولوں سے لاد دوں۔" وہ فریفتہ ہوتے ہوئے بولا، اس کی شریر آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔

"زہے نصیب" فرحت کے انگ انگ سے خوشی ناچ رہی تھی۔

عذرا سر جھکائے دل فگار بیٹھی تھی۔ اس کے منھ سے بے ساختہ ٹھنڈی آہ نکلی۔

"اپنے دل کا یہ دھواں کہیں اور چھوڑو ساری فضا کثیف کر کے رکھ دی ہے۔" ندیم نے اپنے چہرے کے سامنے یوں ہاتھ ہلائے جیسے سچ مچ دھواں اس کی آنکھوں میں پڑ رہا ہو۔ فرحت کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ عذرا کا دل سلگنے لگا۔ اس کی حسین آنکھوں کے جام چھلکنے کو تھے۔

"ایک دم کباب کے آنسو" ندیم نے آنکھ کا اشارہ کر کے فرحت کی توجہ عذرا کی طرف مبذول کرائی۔

"مگر مچھ کے آنسو تو سنے تھے مگر یہ کباب کے آنسو؟" فرحت تعجب سے بولی۔

"تم نے کبھی سیخ پر چڑھتے کباب کو دیکھا ہے جب وہ جلتا ہے تو کیسے کیسے خون کے آنسو بہاتا ہے اور جب یہ اشک دہکتے ہوئے کوئلوں پر پڑیں تو شُوں شُوں کی ہلکی پھلکی موسیقی سی سنائی دیتی ہے، بڑا لطف آتا ہے۔" ندیم نے شریر نظروں سے عذرا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے جلانے کڑھانے پر تلا ہوا تھا۔ فرحت کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ عذرا کو اپنے دل پر شدید گھاؤ کا احساس ہوا۔

"کسی کے دل جلنے کی بو آ رہی ہے۔" ندیم نے عذرا کے قریب منہ کر کے سرگوشی کی۔ عذرا کے دل پر آرے سے چلنے لگے، دکھ سے تن بدن میں مرچیں سی بھر گئیں۔ وہ دل برداشتہ ہو کر اٹھی اور ڈگمگاتے قدموں سے بہ مشکل اپنے کمرے میں پہنچی اور پلنگ پر گرتے ہی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ درد کی ہلکی ہلکی لہروں نے ہول ناک طوفان کا روپ دھار لیا... ندیم کے لگائے ہوئے زخموں کی وجہ سے کسی پہلو بھی سکون میسر نہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کے نایاب گہر گر رہے تھے۔

دل بھی احساس شدت سے کچھ ایسے رویا
جس طرح جسم سے لپٹی ہوئی چھاگل روئے

☆

عذرا بچپن سے آج تک ہمیشہ آنٹی کی آغوش میں سر رکھ کر رویا کرتی تھی اور انھوں نے ہمیشہ اسے پیار اور حوصلہ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ ممتا کے آنچل میں یوں لے لیتی تھیں جیسے دنیا کی آفات سے بچانے کے لیے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے۔ لیکن آج عذرا اکیلی تھی وہ آنسوؤں میں ڈوبتی ہی چلی گئی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب اٹھ کر اس نے وضو کیا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئی کچھ ڈھارس سی بندھی۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے کتنی راحت اور سکون ملتا ہے اس کا اندازہ عذرا کو پہلی بار ہوا۔ کائنات میں سب سے بڑا یقین اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین رکھنا ہے اگر آپ اس یقین تک پہنچے تو پھر خدا تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔

عذرا کے دن اور راتیں اعصاب شکن گزر رہی تھیں۔ اس کا تن من جل رہا تھا۔ وہ

کڑی دھوپ میں جل رہی تھی جھلس رہی تھی۔ اس کے دل کا تمام دکھ درد آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی ابھرتی رہی۔ اسے بڑی گھٹن ہوتی تھی۔ اس کے دل کے پھپھولے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا نہ ہی کوئی مرہم لگانے والا تھا۔ ندیم کا کہنا سچ ثابت ہوا کہ وہ واقعی دل میں درد بن کر بس گیا اور اب اس درد کا درماں کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے لبوں کی مخصوص مسکراہٹ چھن چکی تھی۔ اب تو یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کبھی مسکرائی ہی نہ تھی۔ اس وقت وہ نازک دور سے گزر رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ ندیم کے بغیر اس کی زندگی کس قدر بے کیف اور نامکمل سی ہے۔ ندیم کی محبت جو باہمی چپقلش کی وجہ سے اب تک دل کے کسی گوشے میں پنہاں تھی اب وہ اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ یک لخت بھڑک اٹھی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ناؤ کب پار لگے گی۔

ایک دن اس کے ارد گرد کرنیں سی پھوٹ پڑیں اور اس کے دل کے روزن سے چاندنی جھانکنے لگی، غنچۂ آرزو کھل اٹھا۔ ندیم نے خود بخود ہی اس سے صلح کر لی۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے چند روح پرور الفاظ ہی عذرا کے لیے متاعِ حیات تھے وہ اتنے میں ہی خوش تھی اب اس کے پژمردہ چہرے پر رونق سی آ گئی تھی۔

گرم خوبان چمن اپنے جوبن پر تھا۔ پھول شگوفے جھوم جھوم کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ آسمان پر رنگین کمان تنی تھی۔ دھنک کے رنگ ہر سو پھیل رہے تھے عذرا گلاب کے پھول توڑ کر سوئی سے اپنے بالوں میں اٹکا رہی تھی اس کے چہرے کی چمک دمک لوٹ آئی تھی۔ اس کے گیسو رُخِ زیبا پر پھیل رہے تھے اور وہ اپنی پریشان زُلفوں کو انگلی سے پیچھے ہٹا رہی تھی۔

"عذرا۔" ندیم نے اسے پکارا تو اس نے حسین غزالی آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو ندیم کا چہرہ اپنے سامنے پایا۔ خمار آلود آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ندیم کی بے خوابی کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر عذرا مضطرب و بے چین ہو گئی۔

"آپ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔

عذرا! یہ پریشانی آج سے تو نہیں ہے، یہ ہمیشہ سے میری مسکراہٹ میں چھپی رہی

ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ آج یہ نمایاں ہوگئی ہے۔'' ندیم دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر اس کے مقابل گھاس پر بیٹھ گیا۔ سورج کی کرنیں کائنات پر الوداعی نظریں ڈال رہی تھیں۔

''کیا آپ اپنی غم گسار عذرا کو نہیں بتائیں گے؟''

''ہاں اس بھری دنیا میں تم ہی میری ہمدم اور مخلص ہو جس کے سہارے میں جی رہا ہوں۔ ورنہ یہ صدمہ تو جان لیوا ہوتا ہے۔'' ''عذرا! میں تمھاری ہمدردی کا متمنی ہوں۔ تم میرے لیے کیا کچھ کرسکو گی؟'' وہ خوشامند پر اتر آیا۔

''وہ سب کچھ جو میرے امکان میں ہے۔'' عذرا کا دل چاہا کہ وہ یہ بھی کہہ دے کہ میں تمھارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتی ہوں۔ مگر جذبات کا سیل بے پناہ بے اختیار راستہ ہی میں رک گیا کیوں کہ شرم نے اس کی زبان پر تالے لگا دیے تھے۔

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' ندیم نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور پھر دور خلاؤں میں کھو گیا۔ اُدھر عذرا منتظر تھی کہ وہ کچھ مانگیں اور آگے بات کو بڑھائیں۔

''عذرا! تم جانتی ہو کہ آج کل گھر میں ہماری شادی کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔'' ندیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو یہ سن کر عذرا کا چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا۔ اس نے لجائی لجائی شرمگیں نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔ لیکن ندیم اس وقت نہ جانے کہاں کھوایا ہوا تھا۔

''ہائے اللہ! کتنے بے باک ہوگئے ہیں۔ یہ بھلا ایسی باتیں مجھ سے کیوں کرنے لگے ہیں۔'' عذرا نے دل میں خوش گوار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔ وہ شرما کر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ ندیم نے راستہ ہی میں روک کر کہا۔

''عذرا! تمھاری بے جا شرم سے ہم تینوں کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔'' عذرا کے دل کی دھڑکنیں اور تیز اور بے ترتیب ہوگئیں اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔

''تم نہیں جانتی میں فرحت کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر اپنی زندگی کو قبر کی تاریکی کی مانند سمجھتا ہوں۔'' عذرا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا اور اسے یوں لگا کہ جیسے کسی نے دہکتی ہوئی سلاخیں اس کے کانوں میں ٹھونس دی ہیں۔ وہ ایک دم چونک کر

پھٹی پھٹی نظروں سے ندیم کو یوں دیکھنے لگی جیسے اسے ندیم کی دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔ ندیم نہ جانے اپنی رو میں کیا کچھ کہتا رہا۔ لیکن عذرا کو اپنا پورا وجود سُن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے سپنوں کے رنگین محل ایک ایک کر کے ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہوتے جا رہے تھے۔ ندیم نے زخم کہن کو پھر سے کرید دیا تھا۔

''دل کی بینائی سے دیکھیے میں عذرا ہوں فرحت نہیں کیوں کہ یہ سوال اسی سے تعلق رکھتا ہے۔'' عذرا بہ مشکل اپنے آپ کو شرارت کے موڈ میں لا سکی تھی۔ مگر جلد ہی اس کا گلہ رندھ گیا اور وہ اپنی اس اداکاری میں بری طرح ناکام ہوئی اس کے دل پر آرا سا چلنے لگا جس کے دونوں سرے ندیم اور فرحت نے تھام رکھے تھے۔ عذرا کی آنکھیں آب دیدہ ہوگئیں۔

''لیکن اس وقت تو صرف تمھارے لبوں سے نکلے ہوئے حیات پرور دو الفاظ پر میں اپنی امیدوں کے محل تعمیر کرسکتا ہوں'' ندیم نے کہا۔

''آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔''

اس کی آواز بھرا گئی حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔

''تم اس شادی سے انکار کر دو۔'' ندیم نے دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔

''میں لڑکی ذات ہو کر اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ میری طرح کی نا معلوم کتنی ہی لڑکیاں اس معاملے میں دم نہیں مار سکتیں...آپ خود...کیوں...نہیں انکار کر دیتے۔ عذرا کا دل صدمے سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی اور شدتِ غم سے گرم فغاں تھی۔

''میرے انکار سے ابا حضور مجھ کو جائیداد سے عاق کر دیں گے اور میں زمانے کی ٹھوکریں کھاتا ہوا موت کی گھاٹیوں میں لڑھک جاؤں گا۔'' ندیم نے دکھی نگاہوں سے عذرا کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔

''کیا تم چاہتی ہو کہ تمھارے نادم بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائیں۔'' ندیم نے اپنے مستقبل کی ایسی بھیانک تصویر کشی کی کہ عذرا کرب سے کراہ اٹھی۔ ندیم گریہ بہ مسکین بنا ہوا تھا۔

''نہیں...نہیں عذرا اپنی زندگی میں ایسا کبھی نہ ہونے دے گی۔'' سسکتی ہوئی آواز نکلی۔ مدھ بھرے نینوں سے آب دار گوہر چمکنے لگے۔ لیکن گھنیری پلکیں انہیں نکلنے کا راستہ نہیں دے رہی تھیں۔

''تم کتنی اچھی ہو عذرا! تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی اس کے لیے شکریہ۔ مجھے تم پر فخر تھا اور ہے۔'' ندیم نے بڑے پیار سے اس کے سر کو تھپتھپایا اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

عذرا کا چہرہ اس کی دلی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ روئے تاباں کملا گیا اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ آخر کار موتیوں کو آنکھوں سے نکلنے کا رستہ مل گیا۔ اس نے جلدی سے ندیم کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''میری اس گفتگو سے تمہیں صدمہ تو نہیں ہوا۔'' ندیم نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

عذرا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا بہت کچھ کہنے کو جی چاہ رہا تھا مگر ندیم کی سرد مہری کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس کے لب صرف کپکپا کر رہ گئے۔

''عذرا آپ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ بادشمیم کی جگہ بادسموم چلنے لگی ہے۔ جسم تپش سے جھلسنے لگا ہے۔ اتنی دُکھی شاید پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ عذرا کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ کلیجہ پاش پاش ہوگیا۔ گردشِ دوراں نے اسے جکڑ لیا تھا۔

سمندر کی طوفانی لہریں کنارے کی طرف بڑھتیں اور پھر جھاگ چھوڑ کر لوٹ جاتیں۔ عذرا اونچے سے ٹیلے پر پاؤں لٹکائے شور کرتی ہوئی موجوں کو گھور رہی تھی۔ وہ افسردہ اور دُکھی تھی۔ جذبات کا یہ طوفان دل سے اٹھ کر دماغ کو چھو رہا تھا۔ برسوں کی محبت کے اس تناور درخت کی جڑوں پر کلہاڑے کی کاری ضربات پڑ رہی تھیں اور اس کی جڑیں کاٹنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا اپنا ندیم تھا۔

سمندر کی بڑھتی ہوئی موجیں اس کے پاؤں سے ٹکرائیں تو وہ چونک اٹھی۔ اس کے

خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ آہستہ آہستہ دھوپ ڈھلتی جا رہی تھی۔ تھکا ہارا سورج اتنی مسافت طے کر کے اُفق میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ عذرا کی نظر ایک کیکڑے پر پڑی جو چھوٹی چھوٹی لہروں کی زد میں آکر سمندر میں جا رہا تھا۔ ہمدردی کے جوش میں وہ ننھے کیکڑے کو بچانے کے لیے بے خیالی میں سمندر کی طرف بڑھنے لگی جہاں خطرناک موجیں ایسے بدنصیبوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے قرار ہوتی ہیں۔

سورج نے اس دل شکن اور دل گرفتہ نظارے کی تاب نہ لا کر آنکھیں موند لیں۔ کرنوں نے کائنات پر زردی مائل الوداعی نظریں ڈالیں اور افق کی ارغوانی وادیوں میں روپوش ہوگئیں۔

☆

ندیم جب بنگلے پر پہنچا تو بہت مغموم تھا۔ شرارتوں کی جگہ اداسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور قہقہوں نے ویرانیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ در و دیوار غم آشام تھیں۔

اُدھر ممی بھی غمگین اور پریشان صورت بنائے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھیں۔ عذرا کے اچانک غائب ہو جانے سے ان کا دماغ سن ہو رہا تھا چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں غم سے نڈھال اور پیشانی پر آب دار موتی چمک رہے تھے۔ فرحت ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کے اُلجھے اُلجھے بال اور سوگوار چہرہ بڑا دل کش لگ رہا تھا۔

''کمال کر دیا ممی! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ عذرا غائب ہے۔'' ندیم نے پریشانی سے پوچھا۔

''میں تو یہی سمجھتی رہی کہ وہ کالج گئی ہے۔ جب وہ نہیں آئی تو مجھے فکر لاحق ہوئی میں نے ہر جگہ پتا کرایا کہیں بھی نہیں ملی۔'' ممی نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ صدمے سے ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور بدن پر لرزہ طاری تھا۔

ندیم تیر کی مانند سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ کتابوں کو میز پر پٹخ دیا اور نڈھال سا ہو کر پلنگ پر جوتے اتارے بغیر دھم سے گر پڑا۔ سامنے گل دانوں میں پھول مرجھا چلے تھے۔ ندیم کو یاد آیا کہ کتنی محنت اور دلچسپی سے عذرا اس کے کمرے کو سنوارا کرتی تھی گل دانوں

میں بڑی پابندی کے ساتھ گلاب ونرگس کے تروتازہ پھول سجاتی تھی لیکن وہ اپنی شریر طبیعت سے مجبور ہو کر اس کے سامنے ہی ان پھولوں کو نوچ ڈالتا اور ترتیب سے رکھی ہوئی کتابوں کو بکھیر دیا کرتا تھا۔ ایسا حشر نشر دیکھ کر عذرا ہمیشہ منہ بسور لیا کرتی تھی۔

ندیم بہت پریشان تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ کاش عذرا جلدی سے لوٹ آئے اور پھر سے وہی ہنگامے اور شرارتیں شروع ہو جائیں۔ عذرا کی پر اسرار گم شدگی کا غم تیزاب کی طرح اس کے حلق میں اترتا چلا گیا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ چھت پر لگے فانوس کو تکتے ہوئے خیالوں کے حسین تانے بانے بُن رہا تھا۔

اس کے خیالوں میں عذرا ہاتھوں میں پھولوں کے گل دستے لیے دلربا انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اس نے دھیرے سے مسکرا کر ندیم کو دیکھا اور گل دانوں میں پھول سجانے لگی۔

''عذرا! اب میں ان پھولوں کو کبھی نہیں نوچوں گا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''آنٹی آداب۔'' برآمدے میں کوئی سریلی آواز سنائی دی۔

ایک جھٹکے سے ندیم کے حسین خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''کیا عذرا آ گئی۔'' اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا اور دل میں خوش گوار دھڑکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

''آنٹی! آپ کا پیغام سنتے ہی میں بھاگی آ رہی ہوں۔ عذرا ہمارے ہاں تو نہیں آئی۔'' یہ مسرت کی آواز تھی۔ ندیم دھم سے پلنگ پر گر پڑا۔ اس نے غصے سے تکیہ اٹھا کر دُور پھینکا تو اسے تکیے کے نیچے ایک خط پڑا ہوا ملا۔ ''یہ خط کیسا ہے؟'' ندیم نے جلدی سے لفافہ کھولا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

''ندیم! میں اپنی داستانِ الم کہاں سے شروع کروں میری تو ابتدا ہی انتہا ثابت ہوئی ہے۔ آپ لوگوں کے سوا اس وسیع کائنات میں میرا اور تھا ہی کون؟ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔ اپنوں سے بچھڑ جانا کتنا جان گسل ہوتا ہے۔ کاش، کوئی میرے دل سے پوچھے۔ تم نے ہمیشہ اپنی اجارہ داری مجھ پر مسلط رکھی۔ بچپن سے ہی تم نے دوسرے کزنوں کے ساتھ مجھے

کھیلنے نہیں دیا۔ تمھارا انداز ہمیشہ جارحانہ رہا۔ تم میرا ہاتھ پکڑے ان سے دُور لے جاتے اور میں کشاں کشاں تمھارے ساتھ چلی جاتی۔ مجھے لے جا کر ایک کونے میں بٹھا دیتے۔ خود کھیلتے، دھما چوکڑی مچاتے لیکن مجھے رونے اور فریاد کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ میں حسرت و یاس کی تصویر بنی گیلی لکڑی کی طرح سلگتی اور اشکوں کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتی رہتی۔ تم بڑے متلون مزاج تھے۔ بدلتے موسم کی طرح۔ کزنوں کے ساتھ میرا کھیلنا تم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے تمھارے مزاج کا درجۂ حرارت پچاس سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا تھا اور میرا احتجاج صدا بہ صحرا ثابت ہوتا تھا۔

شاید تمھیں کچھ یاد نہ ہو لیکن مجھے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی یاد ہے۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ میں نے سبز رنگ کے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا تم نے میرے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر مجھے چھ فٹ اونچائی پر دیوار کے ساتھ لگی کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ اس سے میرے کوٹ کے بٹن ٹوٹ گئے اور میں دھان پان اور نازک اندام سی بچی کوٹ کی قید سے آزاد ہو کر زمین بوس ہو گئی۔ کوٹ کھونٹی پر ہی رہ گیا لیکن مجھے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں اور تم تھے کہ اپنا پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے، مذاق اڑاتے رہے اور میں شدت درد سے تڑپ رہی تھی۔ تمھیں میرے جذبات یا دُکھ درد کا کب احساس تھا؟ ندیم! تم نے تو سنگ دلی کی انتہا کر دی تھی۔ ہماری جان گئی تمھاری ادا ٹھہری۔ تم نے کبھی پوچھا کہ تمھارے من میں کیا ہے۔ تم نے ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچا اپنی ہی من مانی کرتے رہے۔ مجھے چوٹ پر چوٹ لگاتے رہے۔ تمھارے عنایت کردہ گھاؤ کو میں نے اپنے سینے میں دفن کر دیا لیکن پھر بھی میں نے انسانیت کا رشتہ نبھایا۔ میں کبھی کبھی نادانی میں اللہ میاں سے شکوہ کر بیٹھتی تھی کہ اے اللہ میاں میرے ماں باپ کو کیوں اُٹھا لیا؟ ایکسیڈنٹ کے وقت میں بھی تھی، میں کیوں بچ گئی موت کے فرشتے کو ذرا بھی ترس نہ آیا کہ یہ معصوم سی کلی بغیر باغبان کے کیسے پروان چڑھے گی؟ میں تو پیدا ہی ہوئی تھی دُکھ جھیلنے کے لیے۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ ندیم! میں بہت ہی نادان تھی جو تمھیں چاہ بیٹھی۔

ویلنٹائن ڈے تو یاد ہے نا۔ محبت کے پھول بانٹنے کا دن۔ جب شاخ و برگ تالیاں

بجا بجا کر اس دن کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تمھارے ہاتھ میں گلاب کے خوب صورت پھولوں کا گل دستہ تھا۔ میں نے بڑی پُر امید نگاہوں سے تمھاری طرف دیکھا لیکن تم نے مجھے نظر انداز کر دیا اور فرحت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ تم نے مجھ پر فرحت کو فوقیت دی، اس کے ساتھ مل کر میرا تمسخر اڑاتے اور طنز آمیز تیروں سے میرا کلیجہ چھلنی کرتے رہے۔ اس گل دستہ میں میرے لیے ایک کلی بھی نہ تھی۔ ان مسرتوں میں میرے لیے ایک پل بھی نہ تھا۔ تم اتنے بخیل کب سے ہوگئے تھے؟ تم نے میرے ارمان چکنا چور کر دیے۔ ان کے ٹوٹے ہوئے سنگریزے میری آنکھوں میں اتر آئے۔ میں کانچ کے ساتھ کھیلتی اور لہولہان ہوتی رہی۔ میرے دل کی ہر دھڑکن تمھاری یادوں کے طوفان سے کانپ کانپ جاتی ہے۔ مجھے تو اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے میری آنکھوں کی قندیلیں گل ہوگئی ہیں۔ دل کا فانوس بجھ گیا میرا جیون کھلونا بن کر رہ گیا ہے اور اس سب کے ذمہ دار ندیم تم ہو صرف تم۔ کیوں کہ تم نے سارے رشتے ناطے اور بندھن توڑ لیے تھے۔

تمھارے دیے ہوئے زخموں کا تابوت اٹھائے پھرتی ہوں۔ تم نے ہمیشہ میری چاہتوں کا صلہ سے بے رحمی دیا۔ جب سے فرحت آئی ہے آنٹی نے بھی میری طرف سے نظریں پھیر لی ہیں۔

آج مجھے احساس ہوا ہے کہ میں تو اس سنسار میں تنہا و یکتا رہ گئی ہوں۔

”ندیم! معاف کرنا جذبات کی رو میں میرا خط بہت طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن میرے لیے جذبات کے آگے بند باندھنا اب ممکن نہیں ہے اور اب تم مجھے شادی سے انکار کرنے پر مجبور کر رہے ہو۔ کاش میں تمھاری اس تمنا کو پورا کرنے کی خود میں ہمت پاتی۔ آہ! میں زندگی بھر ایسا نہ کر سکوں گی۔ کیوں کہ انکل کا دل دکھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ ان کے سامنے میں انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

انکل تو نہایت ہی شفقت و محبت کرنے والے انسان ہیں۔ میں نے ہمیشہ انکل کو اپنا باپ سمجھا ہے انھیں وہی عزت و تکریم اور احترام دیا ہے جو ایک باپ کو دیا جاتا ہے۔ باپ سمجھتے ہوئے ان کی عزت کرتی آئی ہوں۔ کبھی ان کے سامنے میں نے آنکھ اٹھا کر بات نہیں

کی۔ ادب و آداب ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا۔ میں ان کی شفقتوں اور محبتوں کی ٹھنڈی چھاؤں کو کھونا نہیں چاہتی۔ ان کے بغیر میں کیسے جی پاؤں گی۔ میری کل کائنات ہی انکل ہیں۔ انھیں ناراض ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ تمھارا جان لیوا فیصلہ بھی میں نے جی جان سے قبول کر لیا تھا لیکن تم نے کبھی مجھے حوصلہ نہیں دیا کبھی تسلی تشفی نہیں دی تم میری راہ میں کانٹے بچھاتے رہے اور میں ان خاروں کو پلکوں سے چُنتی رہی۔ مگر یہ خنجر جو ابھی تم نے میرے جگر میں پیوست کیا ہے اس سے میری روح تک مجروح ہوگئی ہے۔

لیکن ندیم! یاد رکھنا کہ میں فرحت کی وجہ سے تمھارے ہاتھوں شکست کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نہ جی پاتی ہوں نہ مرتی ہوں۔

بدنصیبی نہیں تو پھر کیا ہے
میرا گلشن پیار کو ترسے

ندیم! آپ سب کے بغیر میں مر جاؤں گی۔ خاص طور پر تمھیں کھو کر تو میرے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگوں سے بچھڑ کر میں پاگل سی ہو رہی ہوں اور مرنے پر مجبور۔ اب میں تمام رشتوں سے ناطے توڑ کر جا رہی ہوں۔ آپ سب ہی میری کل کائنات ہیں۔ آپ سے جدا ہونا میرے لیے سوہان روح سہی لیکن اب میرا ہر اٹھنے والا قدم موت کے قریب ہو رہا ہے۔ میں زندگی سے بھاگ رہی ہوں۔ تم سب سے دُور جا رہی ہوں کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اطمینان رکھو! تمھاری مسرتوں کی راہ میں حائل ہونے والی دیوار جلد ہی مسمار ہو کر سمندر کی گہرائیوں میں پنہاں ہو جائے گی۔ ہم جیسے بے سہاروں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہ ہو تو پانی کی لہریں اسے اپنی دامن آغوش میں پناہ دے دیتی ہیں۔“

ندیم نے عذرا کا یہ طویل خط یا محبت کا اقرار نامہ پڑھا تو تڑپ اٹھا اور فوراً کہا۔

”اُف نادان لڑکی یہ تو نے کیا کر دیا۔ میں تو تمھاری محبت کو پرکھ رہا تھا۔“

کمرے سے نکل کر ندیم نے خط ممی کی گود میں ڈالا اور تیزی سے کار کی طرف لپکا۔

ابا حضور نے جھپٹ کر خط اٹھا لیا اور پڑھنا شروع کر دیا خط پڑھ کر انھوں نے فرحت سے پوچھا۔

"فرحت تم بتاؤ یہ چکر کیا ہے۔"

پہلے تو فرحت مخمصے میں پڑ گئی پھر جھجکتی ہوئی سہمے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"انکل جی۔ دراصل بات یہ ہے کہ کچھ دنوں سے ندیم اور عذرا کی آپس میں چپقلش چل رہی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک تناؤ سا تھا۔ عذرا نے ندیم سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ چناں چہ عذرا کو سبق سکھانے کے لیے میرے ساتھ مل کر ایک پلان بنایا۔ ہمارا خیال تھا کہ عذرا کچھ جلے گی، کڑھے گی اور پھر خود بخود راضی ہو جائے گی۔ رہی شادی والی بات تو یہ ندیم کے اپنے دماغ کی اختراع تھی۔ اس معاملے میں ندیم نے مجھے بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ میں اسے بار بار کہتی رہی کہ بس اتنا مذاق کافی ہے لیکن وہ نہیں مانا بلکہ دو چار قدم اور آگے بڑھ گیا۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عذرا اس حد تک بڑھ جائے گی اور ہاں اس منصوبے میں آنٹی کو بھی شامل کر لیا تھا تبھی وہ دانستہ عذرا کو نظر انداز کرتی تھیں۔

فرحت کی تمام گفتگو سن کر ممی نے فوراً کہا۔

"مجھے تو صرف یہی کہا گیا تھا کہ عذرا بڑی مغرور اور نک چڑھی ہے آپ جو عنایتیں اور پیار کر رہی ہیں انھیں تھوڑا سا کم کر دیں یہ خود ہی سدھر جائے گی۔ ندیم کے من میں کیا کیا منصوبے تھے میں ان سب سے بے خبر تھی۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے اندھیرے میں رکھا۔ اگر میری بچی کو کچھ ہو گیا تو میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا" ابا حضور، ممی سے مخاطب تھے۔ ان کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ تمھارے بے جا لاڈ پیار نے ندیم کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہر بات میں من مانی کرتا ہے۔ تم اسے منع کرنے کی بجائے خود بھی شامل ہو گئیں۔" ابا حضور، ممی پر چیخ رہے تھے۔

ممی کی آنکھوں میں اشکوں کی دھند چھا گئی وہ شدت غم سے گرم فغاں تھیں۔

"آپ مجھ کو ہی دوشی ٹھہراتے ہیں۔ آپ نے بھی تو کبھی اسے سرزنش نہیں کی۔"

ممی کی آنکھوں سے ابر اشک برس پڑا۔

"ندیم کی اب میں وہ گت بناؤں گا کہ تمام زندگی یہ شیطانی بھول جائے گا۔" ابا حضور کا چہرہ بھی شدت گریہ سے زردی مائل ہو رہا تھا۔

ندیم کار کو پوری رفتار سے چلاتا ہوا ساحل سمندر پر پہنچ گیا۔ کار کو چھوڑ کر وہ ٹیلے کے قریب گیا تو دیکھا ایک لڑکی آہستہ آہستہ لہروں کی طرف جا رہی ہے۔

ندیم نے بھاگ کر فوراً بڑی مضبوطی سے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

"عذرا!"

"کون ندیم! کیا تم مجھے مرنے بھی نہ دو گے۔" وہ بریدہ شاخ کی مانند اس کے مضبوط بازوؤں میں گر گئی۔

"حقیقت میں تم ہو بڑی احمق! میرے مذاق کو بھی نہ سمجھ سکی پگلی لڑکی۔ میں تو تمھاری محبت کی آزمائش کر رہا تھا۔ مجھے کیا علم تھا کہ تمھاری بے قراری حد سے بڑھ جائے گی۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا فرحت باجی سے..." وہ انتہائی تعجب سے بولی۔

"بھلا میں اپنی عذرا کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ پھر تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ فرحت کی نسبت پہلے ہی جاوید بھائی سے طے ہو چکی ہے۔" ندیم نے قہقہہ لگایا۔ اور جھک کر عذرا کے شرماتے ہوئے چہرے کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ہائے اللہ!" عذرا نے دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا لیا۔

"میں اتنا گھٹیا شخص نہیں ہوں۔ مجھے اس بات کا از حد دکھ ہے کہ تم میرے مذاق کو سمجھی نہیں اور اس کا اتنا گہرا اثر لیا اور اپنے تئیں مجھے بے وفا اور ظالم شخص سمجھ لیا۔ بیوقوف لڑکی تم مجھے آج تک نہ سمجھ سکیں۔ محبت کا میرا یہ انداز نرالا تھا۔"

آسمان اور سمندر کے آپس میں گلے مل رہے تھے اور غروب ہوتا ہوا سورج سمندر میں غوطہ زن تھا۔ افق کا ارغوانی رنگ عذرا کے چہرے پر آ گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔ ہم تمھارے کچھ نہیں لگتے۔ پاگل لڑکی اگر تم نے آئندہ ایسی حرکت کی تو تمھارا مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ سمجھی تم۔" ندیم نے سرزنش کی۔ اس کا لہجہ بڑا پیار بھرا اور ملامت آمیز تھا۔ لیکن زبان میں بڑی مٹھاس تھی۔

"مجھے کیا معلوم تھا تم میرا اتنا کڑا امتحان لوگے۔" عذرا نے کہا اس کے روئے

تاباں پر خوشی کی کرنیں سی پھوٹ پڑی تھیں۔ نینوں میں جیت کی چمک یا ہارنے کے اشک تھے لیکن اس کی پُرنم آنکھوں میں طمانیت سی جھلک رہی تھی۔

آسمان پر شفق نارنجی رنگ کی قبا پہنے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ریت پر ہوا کی لہروں سے سلوٹیں سی پڑی ہوئی تھیں۔ پرندوں کے کارواں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

وہ دونوں جب گھر پہنچے تو ابا حضور، ممی اور فرحت بھی آ گئے۔

سب نے عذرا کو گھیر لیا۔ عذرا نے دل میں سوچا کہ یہ سب لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے مجھ سے کیسی نادانی ہوگئی۔'' آب خجالت کے قطرے پیشانی پر نمودار ہوگئے۔ وہ شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔

ممی نے آگے بڑھ کر عذرا کو گلے لگا لیا۔

''پگلی کہیں کی! بھلا میں تمھاری طرف سے غفلت برت سکتی ہوں، یہ تم نے سوچا بھی کیسے؟ تم تو میری جان ہو، میری بہت ہی پیاری بیٹی ہو، وہ سب تو ندیم کے کہنے پر ایک مذاق کیا تھا جسے تم نے اپنے دل پر لے لیا۔''

عذرا کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ وہ ممی کی آغوش میں سمٹی جا رہی تھی۔ اُدھر ابا حضور، ندیم کو ڈانٹ رہے تھے۔

''تمھاری شیطانیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ابلیس بھی تم سے پناہ مانگتے ہیں۔ خبردار اگر آئندہ کبھی اس طرح کی حرکت کی۔''

''ابا حضور! میرا یہ لاجواب ڈراما کیسا لگا۔ اس سیریل کی پروڈکشن کیسی رہی؟'' ندیم نے اپنا کان چھڑاتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

''اب میں تمھیں ایسے بندھن میں باندھوں گا کہ تم یہ تمام چوکڑیاں بھول جاؤ گے۔''

''صرف عذرا کے آنچل سے۔'' ندیم نے سر کھجاتے ہوئے شریر سی مسکان سے جواب دیا۔

عذرا کے چہرے پر شرم سے دھنک کے رنگ بکھر گئے۔

ابا حضور نے اپنی چھڑی ندیم کی طرف تانی۔

''ابا حضور اس چھڑی کو نیچے کریں۔ قسم سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ بہت درد ہوگا۔'' ندیم نے بڑی مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

''شیطان کے بچے۔''

''کسرِ نفسی سے نہ کام لیں۔ میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔'' ندیم مسمسی سی صورت بنا کر بولا۔

''تم اب بھی شرارت سے باز نہیں آئے۔'' ابا حضور ہنس کر بولے۔

''ابا حضور! آپ یوں ہی سدا بہاروں کی طرح مسکراتے رہیں۔'' یہ کہہ کر ندیم ابا حضور کے گلے لگ گیا۔ دوسری طرف ابا حضور نے عذرا کو بھی گلے سے لگا لیا۔

کجلائی ہوئی شام کے ماتھے پر ہلال بڑی معصوم سی صورت لیے شرماتا ہوا نکلا۔ مدھم کرنیں ہر طرف پھیلتی چلی گئیں، ہر سُو خوشیاں ہی خوشیاں پھوٹ پڑیں۔

عذرا کی حسین آنکھوں میں لاتعداد رنگ بکھر گئے۔ ایسے رنگ جو پھولوں اور قوس و قزح میں بھی نہ تھے۔

دیگران نصیحت

یہی کوئی شام کے چار بجے کا وقت ہوگا نجمی بھیا ریکٹ گھماتے چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ لیے لان کی طرف آئے جہاں ان کی بھابی اور بھابی سے تقریباً ملتی جلتی شکل کی خوب صورت سی بیٹھی چائے نوش کررہی تھیں۔ بڑے بھیا بھی موجود تھے۔ نجمی جھجک کر واپس لوٹنے والے تھے کہ بھابی کا اشارہ پاکر وہ فوراً ان کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''آپ کی تعریف؟'' نجمی بھیا نے اجنبی لڑکی کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

لڑکی نے گھبرا کر بھابی کی جانب دیکھا تو بھابی نے کہا نجمی! ''یہ میری چھوٹی بہن فرحت ہے۔''

''اور... یہ بڑی مشہور ادیبہ و شاعرہ بھی ہیں۔ جب کبھی اپنے کسی عزیز کو دن کے وقت خط لکھتی ہیں تو چمکیلی دھوپ اور صاف و شفاف آسمان کے باوجود کالے کالے بادلوں کے نیچے سفید بگلوں کی قطاریں انھیں ضرور نظر آتی ہیں اور اندھیری رات بھی ان کے ہاں اکثر چاند کی سنہری و نقرئی کرنوں میں بدل جاتی ہے۔'' بڑے بھیا فرحت کے کسی خط کا حوالہ دے رہے تھے۔

فرحت کے لبوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''اوہو! پھر تو آپ سے مل کر انتہائی مسرت ہوئی۔'' نجمی بھیا ان کی جانب

مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

فرحت نے عمداً ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور گلاب کے پھولوں کی جانب دیکھنے لگی جہاں رنگ برنگی تتلیاں اپنے بادباں کھولے تیر رہی تھیں۔

نجمی بھیا کھسیانے سے ہو کر چائے دانی اپنے سامنے کر کے چائے بنانے لگے۔

''افوہ! ہو بڑے بے صبرے۔ کسی سے کہہ دیا ہوتا تمھارے لیے چائے بن جاتی۔'' بھابی بولیں۔

''بھابی! آپ بڑی عجلت سے کھانے کی چیزوں پر ہاتھ کی صفائی کا کمال دکھا رہی ہیں۔ اس تیزی اور پھرتی کو دیکھ کر بڑے بڑے صابر بھی بے صبرے ہو جاتے ہیں اور یہاں تو مارے بھوک کے پیٹ میں چوہے کرکٹ میچ کھیل رہے ہیں۔'' پھر وہ فرحت سے مخاطب ہوئے۔

''کچھ آپ ہی ہماری اس مشکل کو آسان کر دیں۔''

وہ ان کی جانب دیکھے بغیر اُٹھ کر چلی گئی۔

نجمی بھیا مجسم حیرت بنے بھابی کا منہ تکنے لگے اور وہ دھیرے سے مسکرا پڑیں۔

دوسرے دن نجمی بھیا باغیچہ کے غربی حصہ میں چہل قدمی کرتے ہوئے چلے گئے۔ انھیں باغیچے میں بہت ہی دھیمے سُروں میں کسی کے گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ نجمی دبے دبے قدموں سے آگے بڑھے تو دیکھا کہ تالاب کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے فرحت بیٹھی آہستہ آہستہ اپنی کسی غزل کے شعر گنگنا رہی تھیں۔ تالاب کی ننھی منی لہریں ان کے سفید سفید پاؤں سے ٹکرانے کے لیے بڑھتی چلی آتی تھیں مگر پھر اچانک اس طرح پیچھے ہٹ جاتی تھیں جیسے کوئی آبی پرندہ ہلکی سی آہٹ محسوس کرتے ہی اُڑ جاتا ہے۔ فرحت ہمیشہ کی طرح کھلی کھلی تروتازہ تھی۔ اسے دیکھ کر نجمی بھیا ششدر رہ گئے اور اپنی آواز پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولے۔

''فرحت صاحبہ! آداب۔''

وہ ایک دم گھبرا کر چونک اٹھی اور شلوار کے پائینچوں کو درست کرتے ہوئے کھڑی

ہوگئی۔ جلدی سے فرحت کے چہرے پر حیا چھائی ہوئی تھی۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں سحرانگیز آنکھوں پر یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں کانپ رہی ہوں۔

''اوہو! کتنا سہانا موسم ہے۔ یہ سرسراتی ہوئی لمبی لمبی گھاس، حدنگاہ تک پھیلے ہوئے خوب صورت پھولوں کا سلسلہ، گل داؤدی کا بانکپن یہ سب کچھ کس قدر قابلِ دید ہے اور اس پر آپ کی مترنم اور شیریں آواز نے ماحول کو کس قدر سحر انگیز بنا دیا ہے۔'' نجمی بھیا خوش گوار موڈ میں تھے۔

ان کی بات کو سنی اَن سنی کر کے فرحت آگے بڑھی تو نجمی نے ان کا راستہ روک لیا۔

''ہم ناہر تو نہیں جو آپ کو کھا جائیں گے۔ آپ ہم سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟''

''ہمارے راستے سے ہٹ جایئے۔'' فرحت نے کھا جانے والی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

''تسلیم!'' نجمی بھیا ازراہ شرارت جسم کو تھوڑا سا خم دے کر کورنش بجا لائے۔

اگر فرحت کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے لیے ہنسی روکنا بہت مشکل ہو جاتا مگر فرحت کے چہرے پر تلخی اور غصے کے نقوش مزید گہرے ہو گئے۔

''بدتہذیب۔'' اس نے نہایت غصہ سے کہا۔

''خوب! یہ تو آپ کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!''

نجمی بھیا مسکراہٹ سے بولے۔

''مجھے آپ کی یہ بدتمیزیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔''

''کیا سلام کرنا اور تہذیب کے دائروں میں رہتے ہوئے کسی کے غصہ کی داد دینا بدتمیزی میں شامل ہوتا ہے۔'' وہ بدستور مسکرا رہے تھے۔

فرحت کسی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی چلی گئی اور نجمی بھیا اس کے نقشِ پا کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ سوچنے لگے۔

''کس قدر مغرور لڑکی ہے۔ ہر وقت ناک پر غصہ رہتا ہے۔ اس کو اپنے حسن پر

نازہے اور ہم اس کا غرور توڑ کر دم لیں گے۔ آخر کار کالج کی ساحرہ جیسی خودسر لڑکی کو بھی تو ہم نے اپنے دامِ محبت میں پھانس ہی اور اس سے منگنی بھی کر لی۔ یہ تو پھر اُلھڑ اور گھریلو قسم کی لڑکی ہے جس کو زمانے کی ہوا تک نہیں چھوئی۔ ورنہ وہ سوشل سوسائٹی کے آداب سے بے بہرہ نہ ہوتی۔'' نجمی بھیا کھڑے کھڑے یہ سب سوچ رہے تھے۔

فرحت بہت سادگی پسند تھی۔ اس کی خوب صورت بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کچھ حجاب بھی تھا اور کچھ بے باکی بھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر نمایاں چیز اس کی تمکنت تھی۔ شروع شروع میں وہ نجمی بھیا سے بولنا بھی پسند نہیں کرتی تھی بلکہ انھیں دیکھتے ہی غصے سے چہرہ سرخ ہوجایا کرتا تھا اور پھر اس کے دونوں ابروؤں کے درمیان بل پڑ جاتے اور آہستہ آہستہ یہ بل بھی غائب ہوجاتے تھے۔

نجمی بھیا چالاک اور زمانہ ساز انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھے۔ انھیں اپنے دل کش اندازِ بیان اور گفتگو سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ فرحت نماز پڑھتی ہے تو فرحت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ خود بھی نماز پڑھنے لگے حالاں کہ ان کو مذہب سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

بھابی سردرد کی وجہ سے بستر پر دراز تھیں اور فرحت ان کے قریب کرسی پر بیٹھی میز پوش پر سوزن کاری کر رہی تھیں کہ نجمی بھیا ہاتھ میں کچھ کپڑے پکڑے آگئے۔

''بھابی! دیکھیے اس کم بخت قمیص کے لچھن تمام کے تمام بٹن نکل گئی ہے اور ہم چاک گریبان پھرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ آپ بھی میری قمیص کی مرمت نہیں کرتیں اگر یہی حالت رہی تو لوگ خواہ مخواہ شک کریں گے کہ ہم مجنوں کی تقلید کر رہے ہیں۔''

دونوں بہنیں مسکرا پڑیں۔

''میں تمھارے کپڑوں کی مرمت کرنے والی کون ہوتی ہوں۔'' اچھی بھلی تمھاری منگیتر ساحرہ موجود ہے۔ اسے کہو ہفتہ میں ایک بار آکر تمھاری اور تمھارے کپڑوں کی مرمت کر جایا کرے۔'' بھابی مسکراتے ہوئے بولیں۔

''کیوں نہ گھر کے کسی سگھڑ اور سلیقہ مند کو آزما لیا جائے۔'' وہ فرحت کی جانب

قمیص بڑھاتے ہوئے بولے۔

فرحت نے پہلے بھابی کی طرف دیکھا اور پھر قمیص پکڑ کر بٹن ٹانکنے لگی۔

''اور ادھر دیکھیے۔'' وہ پاجامہ کو فرحت کے سامنے کرتے ہوئے بولے۔ ''دھوبی کے گدھے کو نہ معلوم ہمارے پاجامے کی کون سی ادا بھا گئی ہے کہ اس نے چبانے میں بڑی تکلفی کا ثبوت دیا ہے۔''

''آپ خوشامدی ہونے کے علاوہ چرب زبان بھی بہت ہیں۔'' فرحت زیرِلب مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کا لب ولہجہ بہت شائستہ تھا۔

''خوشامدی نہ بنیں تو کیا کریں۔ سوئی دھاگہ پکڑ کر لڑکی بننا تو ہم کو آتا نہیں۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''آج کل تم ساحرہ کے ہاں کیوں نہیں جاتے۔ کل اس کی امی تمھاری غیر حاضری کی شکایت کر رہی تھیں۔'' بھابی بولیں۔

''یوں ہی بس۔'' نجمی نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

''کہاں تو یہ عالم تھا کہ ساحرہ کی خاطر سرد آہیں بھرا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ اس کے نام سے بھی بیزار دکھائی دیتے ہو مجھے تمھاری اس قلبِ ماہیت پر بہت حیرت ہے۔'' بھابی نے کہا۔

''بھابی! بات دراصل یہ ہے کہ...

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اب ہمیں اپنی اس حماقت پر خود ہی ہنسی آتی ہے۔

''نجمی! یہ تم کہہ رہے ہو۔'' بھابی حیرت سے آنکھیں پھاڑتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''جس نے تمام خاندان کی ناراضگی مول لے کر ساحرہ سے منگنی کروائی ہے اور اب وہی اس طرح کی باتیں کرنے لگے۔ بھئی! میرے لیے تو یہ ناقابلِ یقین ہے۔''

''بھابی! کیا خیال ہے آج پکچر کیوں نہ دیکھیں؟'' بھابی کی بات کو سنا اَن سنا کرتے ہوئے نجمی نے گفتگو موضوع اچانک بدل دیا۔

"خیال تو اچھا ہے مگر میرے تو سر میں درد ہے۔"

"دردِ سر کی شکایت محض عذرِ لنگ معلوم ہوتی ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم اور فرحت چلے جاتے ہیں۔" نجمی نے پوچھا۔

فرحت اس بے تکلفی پر گھبرا اٹھی اور جلدی سے بولی۔

"بھیا! مجھے تو معاف ہی کریں کیوں کہ اگر میں پکچر دیکھنے چلی گئی تو میری نمازیں قضا ہوجائیں گی اور پھر آج کل کی ایکٹریسیں لباس کی جگہ چیتھڑے پہنتی ہیں۔ انھیں کپڑا شاید میسر نہیں ہے اور یہ سب کچھ مجھے سخت ناپسند ہے۔"

"آپ کے لمبے لمبے سجدے دیکھ کر بعض اوقات مجھے وحشت ہونے لگتی ہے کہ کہیں آپ مسجد نہ بن جائیں۔" نجمی نے کہا۔

"اگر میں مسجد بن گئی تو میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ پھر آپ جیسے لوگ جن کی جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپتے ہیں، کم از کم وہ تو نہ تڑپا کریں گے۔" وہ بولی۔

بھابی شرارت بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔

"نجمی! صبح تمھیں نماز پڑھتے دیکھ کر پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا اور پھر جب آنکھوں کو مل کر یہ یقین دلایا کہ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی لیکن آج ذرا یہ تو بتا دو کہ نمازیں پڑھنے کے پیچھے تمھارے کیا کیا مقاصد ہیں میں نے تو کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ تم یوں نمازیں پڑھنا شروع کردو گے آخر تمھیں سوجھی کیا ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ! آپ نہ یوں چین لینے دیتی ہیں اور نہ ووں، شکر کریں میں راہِ راست پر آرہا ہوں۔"

"سچ کہتی ہوں تمھارے بھیا بھی تعجب کررہے تھے۔" بھابی نے کہا۔

"ارے ہاں، یہ بھائی جان کا ذکر آیا تو آپ یہ تو بتا دیں کہ وہ آج کل کہاں غائب رہتے ہیں۔ گھر میں تو نظر ہی نہیں آتے۔" نجمی بولے۔

"تمھاری دعا سے گھڑ دوڑ کا شوق ہوگیا ہے۔ بس دیکھتے جاؤ اس بات پر کسی نہ

کسی دن تمھارے بھیا سے پھڈا ہوجائے گا۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ بھائی جان ہمارے لیے کسی نئی بھابی کا انتخاب نہ کر گزریں۔"

"اتنے تو خیر تمھارے بھیا کے سر پر بال بھی نہیں ہیں۔" بھابی نے جواب دیا۔

"اس قسم کے موقعوں پر عموماً سر سے بال غائب ہوجایا کرتے ہیں، بھابی آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں۔" نجمی نے جواب دیا۔

"بھیا! اگر مقدر میں کسی سوتن کے نازنخرے اٹھانا لکھا ہے تو یونہی سہی۔" بھابی ٹھنڈا سانس لے کر بولیں۔

"ارے آپ کیا فلسفہ لے بیٹھیں۔ بھابی! آپ ایک دم سنجیدہ کیوں ہوگئیں آخر بات کیا ہے اور آپ کے چہرے پر یہ دکھ کے سائے سے کیوں ہیں؟" نجمی نے گھبرائے گھبرائے انداز میں پوچھا۔

فرحت دُور خلاؤں میں گھورتے ہوئے نہ معلوم کیا سوچ رہی تھیں۔ نجمی کے توجہ دلانے پر وہ چونک پڑی اور دھیرے سے مسکرا کر ان کو قمیص اور پاجامہ دے دیا، وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے جاتے جاتے پھر دروازے ہی سے لوٹ آئے اور کہنے لگے۔

"بھابی! ایک مزیدار قصہ تو سنانا بھول ہی گیا۔ ایک روز کی بات ہے کہ میں گنگارام بلڈنگ کے قریب بس اسٹاپ پر پہنچا۔ مجھ سے پہلے ہی ایک جوان برقعہ پوش خاتون کھڑی تھی۔ جو ایک غنڈے کے ناشائستہ طرزِ عمل سے بہت ہی پریشان ہورہی تھی۔ وہ کم بخت بُری طرح فقرے کسے جارہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے راہِ فرار ڈھونڈنا چاہی۔ مگر وہ میری دسترس سے نہ نکل سکا اور میں نے اس غنڈے کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا۔ اس شریف خاتون نے اطمینان کا سانس لیا اور میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے کہا محترمہ! ممنون ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ہر مسلمان بھائی کا فرض ہے کہ وہ اپنی بہنوں کو ایسی مشکلوں سے چھٹکارا دلائیں غنڈہ عناصر کا سدباب اسی طرح ہوسکتا ہے۔"

فرحت نجمی کی زبانی یہ قصہ سن کر بہت متاثر ہوئی اور نجمی پر دادِ تحسین بھری نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"واقعی یہ برائی تو بہت بڑھتی جا رہی ہے کسی خاتون کا گھر سے اکیلے نکلنا محال ہوگیا ہے کہ اگر کوئی عورت اکیلی کہیں جا رہی ہو تو کوئی نگوڑا فحش قسم کا فلمی گیت الاپتا ہوا پاس سے گزر جائے گا۔ یہ حالات تو ہماری برداشت سے باہر ہوگئے ہیں۔ کاش بھیا! آپ جیسے چند شریف مرد مل کر اس غنڈہ گردی کے انسداد کے لیے کوئی سخت اقدام کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ایک تو بے چاری عورت پہلے ہی بڑی مظلوم و محکوم ہے پھر اس پر مزید ایسے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں کہ عورت کا گھر سے باہر آنا جانا بھی دشوار ہوگیا ہے۔"

"یوں تو خیر میں عورتوں کی آزادی کا قائل نہیں ہوں مگر عورت واقعی مظلوم ہے۔ اگر ہم مرد تعاون کرلیں تو عورت کو اس مصیبت سے آزاد کر سکتے ہیں۔ اس کا بہتر حل یہ ہے کہ غنڈوں کو ایسی سخت سزا دی جائے کہ دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ عبرت ہو۔ نجمی بولے۔

"بھیا! آپ کتنے بلند کردار انسان ہیں۔" فرحت نے عقیدت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نجمی بھیا نے جو ترپ چال چلی تھی وہ اس کی کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔

☆

گلابی جاڑوں کا موسم تھا سب کا دل پکنک پر جانے کے لیے مچلنے لگا آخر کار ایک دن انھوں نے پکنک کا پروگرام بنایا ہی لیا اور یوں سب ہنسی خوشی پکنک کے لیے روانہ ہوئے۔

گلابی جاڑے کی دوپہر میں سب لوگ باغِ جناح میں پکنک کے مزے اُڑا رہے تھے کہ اچانک نجمی ہاتھ میں کیمرہ تھامے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

"میرے خیال میں فوارے کو بیک گراؤنڈ میں لے کر تصویریں کھینچی جائیں تاکہ اس پکنک کی یادگار محفوظ ہوجائے۔" بھابی، بڑے بھیا اور بچے فوارے کے قریب کھڑے ہوگئے مگر فرحت کسی صورت بھی تصویر بنوانے کے لیے آمادہ نہ ہوئی۔

"فرحت صاحبہ! یقین کریں آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوگی۔ اِدھر میں نے بٹن دبایا اُدھر کھٹ سے آپ کا عکس کیمرے میں محفوظ ہوا۔" نجمی سنجیدگی سے بولے۔

فرحت نے خفیف سا مسکرا کر چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

"فرحت! جلدی سے آجاؤ دیر ہو رہی ہے۔" بڑے بھیا نے پکارا۔ فرحت طوعاً و کرہاً سب کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

"مولانا! یہ اود بلاؤں جیسا چہرہ تو ٹھیک کریں۔" نجمی کیمرے کے اندر جھانکتے ہوئے فرحت سے مخاطب تھے۔ فرحت دھیرے سے مسکرا پڑی۔

دو تین تصویریں لینے پر بھی نجمی مطمئن نہ ہوئے وہ تو یہ چاہتے تھے کہ ہر پوز میں صرف فرحت کی تصویریں ہوں مگر فرحت اس کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے بڑے بھیا کے اصرار کرنے پر گروپ میں مجبوراً شامل ہونا پڑا تھا ورنہ وہ تو اس کے لیے بھی تیار نہ تھی۔

کھانا کھانے کے بعد سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ نجمی بھیا، فرحت کے ساتھ چلنے میں فخر کر رہے تھے اور انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت ان کا بخت عرش پر ہے۔ باغ کی چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھتے ہوئے نجمی کسی فلمی گیت کی دُھن الاپنے لگے۔

"غالباً کسی نے ایسی ہی بھدی اور بے سُری آواز سے تنگ آکر گانے کو حرام قرار دیا ہوگا۔" فرحت تبسم بکھیرتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں! وہ بھی کوئی آپ کی ہی ٹائپ کا مولوی ہوگا۔" نجمی بھلا کب خاموش رہنے والا تھا۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد فرحت ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔ نجمی ٹیلے پر ایک ٹانگ رکھ کر کھڑے ہوگئے اور فرحت کو تکنے لگے۔ نجمی، فرحت کے چہرے کی رعنائی کو اپنی نگاہوں میں سموتے رہے۔ اس کے مہکتے گیسو اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور گلابوں جیسے رخسار دھوپ کی تمازت سے ارغوانی ہو رہے تھے۔ اس میں کچھ نجمی بھیا کی آنکھوں کی تپش بھی شامل تھی۔ اس لیے وہ نظریں جھکائے خجالت سی محسوس کر رہی تھی۔

سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا آسمان پر سپید بادلوں کے گالے ساکن کھڑے تھے۔ درخت اور پھول، آفتاب کی کرنوں سے زر پوش تھے۔ شمیم گل ہر سُو پھیل کر دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔

"اُف دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت ہورہی ہے۔" نجمی بھیا نے کہا اور کوٹ اُتار کر بڑی بے تکلفی سے فرحت کے کندھوں پر ڈال دیا۔

عطر، پسینہ اور سگریٹ کی ملی جلی ناگوار بُو اس کی ناک کے ذریعے دماغ میں گھس گئی۔ فرحت نے جھنجلا کر نجمی کا کوٹ ٹیلے پر پٹخ دیا۔

"ارے ناس مار دیا آپ نے میرے کوٹ کا۔"

"ہیلو نجمی!" کسی نامعلوم شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اوہو! احسان تم۔" یہ کہہ کر نجمی اپنے دوست احسان سے باتیں کرتے ہوئے کافی فاصلے پر چلے گئے۔

نجمی کے جانے کے بعد غیرارادی طور پر فرحت ان کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ نجمی بڑے لاپروا تھے۔ جیبوں میں منوں کوڑا بھرا پڑا تھا۔ سگریٹ، دیا سلائیاں، ٹوفیاں، چاکلیٹ اور ان کے مڑے تڑے کاغذ کے پُرزے غرض کہ ہر طرح کا کچرا جیبوں میں موجود تھا۔ اندر کی جیب سے فرحت کو ایک تصویر ملی۔ فرحت نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا تو یہ اس کی اپنی تصویر تھی اور تصویر کی پشت پر نفاست سے تحریر تھا۔ "عزیز ترین ہستی"

یہ پڑھ کر اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دل پھیپھڑوں کی دیواروں سے سر پھوڑ رہا ہے۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ نہ معلوم شرم سے یا غصہ سے۔

فرحت کے من میں جھانکنا اور اس کے دلی تاثرات کا پتا چہرے سے معلوم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی تصویر کو اپنے کوٹ کی جیب میں اڑس لیا اور نجمی بھیا کے کوٹ کو گود میں رکھے گم صم بیٹھی رہی۔

اتنے میں احسان سے فارغ ہو کر نجمی آگئے اور آتے ہی کہنے لگے۔

"کمال کردیا آپ نے تو بھئی! میں نے تو آپ کی حفاظت میں کوٹ دیا تھا اور آپ قبضہ ہی جما بیٹھیں۔ خدا کی قسم مرا جارہا ہوں سردی کے مارے اور اگر کچھ دیر اور یہی حالت رہی تو میں آئس کریم بن جاؤں گا۔"

فرحت کا چہرہ متغیر سا ہوگیا۔ وہ سہم کر رہ گئی اور دل، شوریدہ سر ہونے لگا کہ کہیں انھوں نے مجھے تصویر نکالتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا۔ اوہو میں بھی کتنی بیوقوف ہوں بھلا ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو میری اپنی تصویر ہے جو انھوں نے میری البم سے چوری کی ہے بلکہ یہ تو سزا کے مستحق ہیں۔

"لیجیے اپنا کوٹ۔"

"شکریہ! میں تو سمجھا تھا کہ اب کوٹ سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے محبت بھری نظروں سے فرحت کو دیکھنے لگے۔

ہوا کے ساتھ چنبیلی کے پھول اچک اچک کر فرحت کی گود پر نچھاور ہورہے تھے۔ نجمی نے ازراہ شرارت شاخوں کو جھنجوڑ ڈالا اور بے شمار پھول اور خوابیدہ کلیاں فرحت کی گود میں اور بالوں میں اٹک گئیں۔

"اوہو! سچ مچ آپ تو گلوں کی شہزادی معلوم ہورہی ہیں۔" نجمی کی آنکھیں فرحت کے حسین چہرے پر مرکوز ہوکر رہ گئیں۔

وہ گھبرا اٹھی۔ "شکریہ اس عزت افزائی کا۔" وہ قدرے ترش لہجے سے بولی اور کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہوگئی۔

وہ دونوں واپس آگئے۔ اپنی تصویر نکالنے کے بعد فرحت کو چپ سی لگی ہوئی تھی اور کھوئی کھوئی سی تھی معلوم نہیں کیوں وہ بار بار کسی خیال میں مستغرق ہوجاتی تھی۔

"بھابی! کچھ لوگ کسی بات پہ منھ پھلائے بیٹھے ہیں۔" نجمی بھیا، فرحت کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولے

"بھابی! کیا انھیں رات بستر نہیں ملا تھا۔"

"کیا مطلب۔" بھابی، فرحت کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

"سنا ہے جو رات کو بھی کھردری چارپائی پر سوتا ہے وہ تمام دن منھ بسورے رکھتا ہے۔"

فرحت کے چہرے پر تلخی چھا گئی اور ماتھے کی نسیں تن گئیں۔

''بس نجمی! تمھارا دماغ تو ہر وقت شرارتوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔'' بڑے بھیا نے کہا۔

''بھیا! سنجیدہ رہنا میرے بس کا روگ نہیں ہے کیوں کہ ہم سے سنجیدگی اسی طرح کوسوں دُور بھاگتی ہے جس طرح لاحول سے شیطان۔'' نجمی بھیا بولے اور کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے سائڈ کے آئینے کو اس زاویے پر گھمایا کہ اس میں فرحت کا عکس صاف دکھائی دینے لگا۔

فرحت نے اس حرکت کو نوٹ کرلیا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور وہ پہلو بدل کر ایسے زاویے سے بیٹھ گئی کہ اب نجمی کو صرف پشت ہی نظر آرہی تھی۔

☆

ڈرائنگ روم میں بھابی اور نجمی رمی کھیل رہے تھے۔ اور فرحت نیٹنگ کرتی ہوئی بچوں کو کہانی سنا رہی تھی۔

''بھابی!

جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

نجمی زور سے پتا میز پر پھینکتے ہوئے بولے۔

''ہمیں تو پہلے ہی تمھارے بھیا نے خاکستر بنا کر رکھ دیا ہے اب تم اور کیا جلاؤ گے؟'' بھابی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''آپی! آپ میں خود اعتمادی اور ہمت بالکل نہیں ہے۔ اسی لیے دولہا بھائی کی چاپلوسی میں آکر آپ ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ آخر آپ سختی سے کام کیوں نہیں لیتیں۔'' فرحت کہانی کو ادھورا چھوڑتے ہوئے بولی۔

''بی بی! ابھی تم ناتجربہ کار لڑکی ہو۔ اس لیے تمھیں مردوں کی فطرت کا علم نہیں ہے۔ مرد فطرتاً سرکش اور خودغرض واقع ہوا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی نالائق اور برا کیوں نہ ہو وہ عورت کی سخت گوئی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ دیر سے گھر لوٹنے پر اگر کبھی استفسار کرو تو ایسا بہانہ تراشتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب تو میں نے ان کے نت نئے بہانوں

سے تنگ آکر پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے اور اپنے مقدر کی کشتی صرف خدا کے بھروسے پر چھوڑ دی ہے۔''

''مجھے خود بھائی جان کی ان حرکات پر تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ باہر طوفان اُٹھ رہا ہے اور جناب والا کا کہیں نام ونشان تک نہیں ہے۔'' نجمی بھیا بولے۔

''آنٹی! آپ ہماری کہانی تو مکمل کردیں۔'' بچے ان کی گفتگو سے بور ہوکر بولے۔

''بھئی بچو! اس وقت میرا موڈ کہانی سنانے کا نہیں ہے اس لیے تم جاکر آرام کرو۔'' فرحت نے جواب دیا اور بچے منہ بسور کر رہ گئے۔

کچھ دُور بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجا۔ پھر ہوا کے چند آوارہ جھونکے درختوں کی ٹہنیوں سے سر پھوڑنے لگے۔

''میرا دل ہول کھا رہا ہے نہ جانے وہ اتنی طوفان خیز رات میں کہاں ہوں گے۔'' بھابی نے کہا۔

''لیجیے دولہا بھائی سے ہمدردی شروع ہوگئی۔ یہی ہمدردی تو ہے جس نے ان میں اتنی ہمت اور جرأت پیدا کردی ہے، آپی آپ کی زندگی اتنے دل شکن حادثات سے معمور ہے کہ اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو نیم مردہ ہوکر رہ جاتا مگر آپ سخت سے سخت صدمے اٹھا کر بھی مسکرانے کی عادی ہوگئی ہیں۔'' صرف کی یہ باتیں سن کر بھابی کہنے لگیں۔

''بھئی! قسمت کے ہاتھوں دنیا سے بیزار ہوجانا مجھے نہیں آتا۔ دراصل مصائب سے کھیلنا ہی زندگی کو خوش گوار بناتا ہے، جینے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ میری ملنے والیاں میری ازدواجی زندگی کو بے حد پُرسکون تصور کرتی ہیں اور ہمیشہ یہ کہتی ہیں کہ کاش ہماری لڑکیاں بھی سلمیٰ جیسی خوش بخت ہوں، لیکن میں ہوں کہ ہمیشہ یہ دعا کرتی ہوں کہ اس جہان میں مجھ جیسا بدنصیب کوئی نہ ہو۔ عورت ہر قسم کے مصائب و آلام کا خندہ پیشانی سے استقبال کرسکتی ہے مگر سوتن کا خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ یہ خیال زندگی کو کھوکھلا اور روح کو بے جان کردیتا ہے لیکن اس کے باوجود میں سوتن کی موجودگی پر بھی رنجیدہ نہیں ہوں۔''

"سوتن کی موجودگی پر؟" نجمی بھیا حیرت سے بولے۔

"پچھلے ہفتہ انھوں نے رضیہ کے ساتھ نکاح کرلیا ہے اور اس کے لیے ایک علاحدہ مکان بھی لے لیا ہے زیادہ تر اب وہیں پڑے رہتے ہیں۔" بھابی نے دھماکہ سا کیا۔

"کیا؟...لیکن آپ کو کیسے علم ہوا؟"

"کل ان کے دفتر کے کلرک نے مجھ کو بتایا تھا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ انھوں نے مجھے اعتماد میں نہیں لیا اسی لیے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔" کیا میں ان کی خوشیوں میں روڑے اٹکا دیتی؟" بھابی نے کہا۔

"آپ نے ان کی اس حرکت پر تنبیہ کیوں نہیں کی۔" فرحت نے پوچھا۔

"میرے رونے چلانے سے وہ باز تھوڑے ہی آجاتے بلکہ ایسا رویہ اختیار کرنے پر ممکن ہے کہ مجھے اپنے گھر سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے اور میرے بچوں کی زندگی دُکھ درد بن کر رہ جاتی۔ صبر اور عالی ظرفی ہی سب سے بہتر ہتھیار ہیں اور میں نے ان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دوسرے مجھے کامل یقین ہے کہ خداوند تعالیٰ میرے صبر کا پھل ضرور عطا کرے گا۔" بھابی نے کہا۔

"بھابی! آپ بہت ہی بلند حوصلہ خاتون ہیں۔ اس پر آشوب زمانے میں آپ جیسی عالی ظرف خواتین کا ملنا ناممکن ہے۔" نجمی بھیا تاش کو پھینٹتے ہوئے بولے۔

"تاکہ مرد دوسری شادی کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں۔ یہی ہے نا آپ کا مطلب؟" فرحت قدرے ترش روئی سے بولی۔

"اوہو! آپ نے میری بات کا غلط مطلب لیا ہے۔ آج اندازہ ہوا ہے کہ عورت کو ناقص العقل کا خطاب کیوں عطا کیا گیا ہے۔" نجمی مسکرا کر بولے۔

"مرد اپنے آپ کو عقل مند سمجھ کر عورت کو بیوقوف ہونے کا طعنہ تو ضرور دیتے ہیں لیکن عورت جتنی عقل مند، بلند حوصلہ اور صبر و ایثار و وفا کی پتلی ہے مرد اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ آپ ہمت و استقلال سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ مجال ہے جو دولہا بھائی کو دیکھ کر آپ کے چہرے پر شکن بھی آتی ہو۔" فرحت بڑے جوش میں بول رہی تھی۔

بھابی ہنس کر بولیں۔

"بھئی! شادی تو میرے شوہر نے کی ہے اور تم دونوں خواہ مخواہ الجھ رہے ہو۔ چھوڑو اس فرسودہ قصے کو۔"

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ رات کسی گنہگار کے ضمیر کی مانند سیاہ تھی۔ بچے سونے کے لیے ضد کرنے لگے تو بھابی رمی کے کھیل کو ادھورا چھوڑ کر بچوں کو لے کر چلی گئیں۔

بھابی اور بچوں کے جانے کے بعد ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ فرحت بھی اٹھ کر جانے لگی تو نجمی بھیا بولے۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔"

"نہیں تو۔" مختصر سا جواب ملا۔

"آپ کے روکھے پھیکے جواب سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دال میں کالا ضرور ہے۔"

"دال میں کالا کالا تو دال کھانے والے جانیں۔ ہم تو گوشت خور ہیں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"خیر اس طرف سے تو اطمینان ہوگیا کہ آپ ناراض نہیں ہیں۔ مگر یہ ابھی تک معلوم نہ ہوسکا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی یا صرف یک طرفہ ہی ہے۔"

"آپ کا فرمانا وضاحت طلب ہے۔" فرحت کے چہرے پر غصے کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

"میں آپ کو زندگی کے ہر سانس کے ساتھ چاہنے لگا ہوں۔ اور آپ..."

یہ سنتے ہی فرحت غصے سے بھنّا اُٹھی اور بڑے طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔

"کیوں نہ ہوتی آخر مجھ سے محبت۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! آپ بھی تو دولھا بھائی کے بھائی ہیں۔ انھوں نے اپنی بیوی سے فریب کیا اور آپ اپنی منگیتر سے دغا کر رہے ہیں۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ میں ساحرہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا تھا۔ اس کے سوا

دنیا میں مجھے کوئی اور حسین نظر نہیں آتا تھا مگر جس دن سے آپ نے چپکے سے میری زندگی میں قدم رکھا ہے۔ اس دن سے ساحرہ کی محبت کا نشہ اُتر گیا ہے اور اس کا حسن آپ کے سامنے ماند پڑ چکا ہے اب دن رات اٹھتے بیٹھتے آپ ہی کا تصور، میرے تخیل کے افق پر ابھرتا رہتا ہے۔'' وہ اس قدر دل کش انداز میں بول رہے تھے گویا فرحت اپنی تعریف سن کر انھیں ابھی پسند کرنے لگے گی۔

''آپ کوئی فکر نہ کریں۔ یہ نشہ بھی دوسرا ساغر آنے تک ٹوٹ جائے گا۔'' فرحت کی آواز میں طنز کی آمیزش تھی۔

اس پر نجمی نے کہا۔

''زندگی میں بعض ایسی ہستیوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو بھلائے نہیں بھولتیں اور ان کی شخصیت کے نقوش دلوں پر ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔''

فرحت کہنے لگی۔ ''نجمی بھائی! آپ دھیان سے میری بات سن کر اپنی گرہ سے باندھ لیں کہ مجھ جیسی غیور و خوددار لڑکی ایک ایسے مرد کو ہرگز پسند نہیں کرے گی جو شریف لڑکیوں کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر آپ جیسوں پر اعتبار کرنا تو سراسر حماقت ہے۔ آپ میری خاطر اپنی اس منگیتر کو چھوڑ سکتے ہیں جس کے حصول کے لیے آپ نے تمام خاندان کی ناراضگی مول لی تھی۔ کل کلاں آپ کسی اور لڑکی کو دیکھ کر پھسل جائیں گے اور یوں مجھے بھی ساحرہ کے زمرے میں شامل کر دیں گے۔''

''اوہو آپ تو معمولی سی بات پر مشتعل ہو گئی ہیں۔ حالاں کہ آپ تو ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اپنے افسانوی کرداروں کو (ہیرو و ہیروئن) اس قدر بے باک دکھاتی ہیں کہ انھیں سوائے رومان کے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔'' نجمی بولے۔

''نجمی صاحب سنیے، افسانہ نگار ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نسوانی حجاب میری فطرت سے زائل ہو گیا ہے۔'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔ ''میں اتنی بیوقوف نہیں کہ آپ کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر اپنی انفرادیت کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں۔ تمام مرد

ہم عورتوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں تم مردوں کے نزدیک کسی عورت کے جذبات و احساسات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تم لوگ نادان لڑکیوں کو ان کے کانوں میں محبت کا منتر پھونک کر اپنی ہوس کا شکار کر لیتے ہو۔''

''افسوس کہ آپ نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں ان مردوں جیسا نہیں ہوں۔'' اب نجمی ایسے بول رہا تھے جیسے کوئی کنوئیں کی گہرائی میں سے بول رہا ہو۔

''مسٹر نجمی! خاندان کا ایک فرد سمجھ کر میں نے آپ کا لحاظ کیا ہے۔ ورنہ میرے پاس ایسی باتوں کا جواب جوتوں سے ملتا ہے۔ میں آپ کو ایک شریف انسان سمجھ کر بھیا کہتی تھی اور مجھے آپ پر بے حد اعتماد تھا اور اس پر میں فخر بھی کرتی تھی۔ اسی اعتماد کی بنا پر میں آپ سے بے تکلف ہو گئی تھی اور مجھے کامل یقین تھا کہ آپ بھی مجھے بہن سمجھتے ہیں مگر آپ نے میرے اس مقدس جذبے کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ کاش! آپ محسوس کر سکتے کہ آپ نے ایسی اخلاق سوز حرکت کر کے اپنے آپ کو ان غنڈوں میں شامل کر لیا ہے جن کو آپ نے جیل بھجوادیا تھا اور میں نے اسی دن سے آپ کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا مگر اب وہی نگاہیں آپ پر نفرت اور حقارت کی بارش برسا رہی ہیں۔ آپ اپنا محاسبہ ذرا خود کریں کہ ایسے غنڈوں کے انسداد کے لیے کیا اقدام کیے جائیں جو شریف گھروں میں ہی عشق فرمانے لگتے ہیں۔ مجھے افسوس تو اس بات پر ہے کہ میں نے آپ پر بھروسا کیوں کیا؟ پہلے کی مانند محتاط کیوں نہ رہی اور میں نے اپنے سخت رویہ کو برقرار کیوں نہ رکھا؟ میری سمجھ میں یہ کیوں نہ آیا کہ آپ ایسے ناصح ہیں جس پر یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ:

خود را فضیحت دیگراں را نصیحت''

نجمی صاحب! آپ اتنے گر جائیں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آپ تو زغال کی مانند ہیں۔ آپ اس معاشرے میں کوڑھ زدہ شخص کی طرح ہیں جس کے جسم سے تعفن اٹھتا ہے۔ آپ کے دل و دماغ کو دیمک لگ چکی ہے اور وہ آپ کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ انسانیت نام کی کوئی چیز آپ کے دل میں نہیں ہے۔ سونامی طوفان اور تباہ کن زلزلے آپ جیسے گنہ گاروں کی بداعمالیوں ہی کی وجہ سے آتے ہیں اور پھر یہ معصوم بے قصور

لوگوں کو بھی خس و خشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں۔ انھیں نا کردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی خوف و دہشت کی علامت بن گئے ہیں۔ کاش مجھے ایک دن کی حکومت مل جائے سب سے پہلے آپ جیسوں کی بیخ کنی کروں گی۔''

وہ غصے بھری نظریں نجمی پر ڈالتی ہوئی اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

اور نجمی...، وہ ایک دم یوں چونک اٹھے جیسے اچانک کسی چیز کے گرنے سے سوتا ہوا انسان ہڑبڑا کر بیدار ہوتا ہے۔ نجمی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے آسمان کی بلندیوں سے اسے پستیوں میں دھکیل دیا ہے اور وہ نیچے ہی نیچے گرتا جا رہا تھا۔

ارمانوں کے ویرانے

وہ نہ جانے کیوں بے حد افسردہ تھا۔ ماضی کا تصور اسے زہریلی ناگن کی طرح اندر ہی اندر ڈس رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کتنی حسرتیں اور تمنائیں دم توڑ رہی تھیں۔

''میں دنیا کو دوش دوں یا اپنی تقدیر کا ماتم کروں!'' اس نے دُکھی لہجہ سے کہتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا۔

باہر سفید روئی کے گالوں جیسی برف آہستہ آہستہ گر رہی تھی۔ نہایت حسین و دل کش منظر تھا۔ اس نے اوورکوٹ پہنا اور مفلر سے کان سر لپیٹتے ہوئے بوجھل قدموں سے باہر آ گیا اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر برف گرنے کے منظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے کسی سودائی کی مانند اس کو گھورنے لگا۔

انسان کی زندگی میں کتنے ناقابلِ فہم حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس پُر کیف منظر کو دیکھ کر اس کے بھرتے ہوئے زخم رسنے لگے۔

بیتے دنوں کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے۔ اس کے دل کے ٹوٹے ہوئے رباب سے دُکھ کی جھنکار پیدا ہونے لگی۔ اسے آج اس سرزمین کی یاد ستا رہی تھی جہاں قدم قدم پر اس کی ناتمام حسرتیں بکھری پڑی تھیں۔ دھندلکے میں اس کی کھوئی کھوئی بے رونق آنکھیں اور خاموش چہرہ ہزاروں حسرتوں کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''کاش پیار بھرے حسین لمحات پھر لوٹ کر آ جائیں۔'' اسے کسی کل قرار نہیں آ رہا تھا۔ برف باری ختم ہو گئی اور آسمان پر

ستارے پوری آب و تاب سے چمکنے لگے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں چاند پر جم کر رہ گئیں اور وہ ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

☆

ناہید کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے وسیم نے غیر ارادی طور پر اندر دیکھا تو اسے ناہید سر جھکائے کام میں مصروف نظر آئی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بڑی تیزی سے نٹنگ کر رہی تھیں۔ اتنا دیکھتے ہی وہ جھٹ دریچے میں چڑھ آیا اور وہیں اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آہاہا! یہ سلائیاں یہ اون، معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جنابہ کو دست کار بننے کا شوق ہو رہا ہے۔''

ناہید جانتی تھی کہ اگر جواب دیا تو پھر وہ گلے پڑ جائے گا۔ لہٰذا وہ خاموش بیٹھی رہی۔ لیکن وسیم کو بھلا کب چین تھا۔

''اے دست کاری کی استاد اعلیٰ۔ اے سگھڑوں کی ملکہ، تیرے در پہ ایک فقیر دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ یہ فقیر تم سے اپنا سوئیٹر نہیں بنوانا چاہتا کیوں کہ میرے احباب اتنے بُرے سوئیٹر کو دیکھ کر مذاق اڑائیں گے۔ یہ فقیر تو صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ خاکی رنگ کی یہ پل اوور کس کور ذوق شخص کے لیے بُنی جا رہی ہے؟''

یہ سن کر اور وسیم کی مسمسی صورت دیکھ کر ناہید بے اختیار ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ اندر کود آیا۔

''شکر ہے۔ غبار چھٹا خدا خدا کر کے۔''

''آپ بہت بے کل ہو رہے ہیں اچھا تو سنیے یہ سویٹر میرے فوجی کا ہے۔''

''تمھارے فوجی کا۔'' وہ آنکھوں کو جلدی جلدی جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب!'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ جانتے ہی ہیں آج کل کشمیر کے محاذ پر کتنے ہی جوان حصول آزادی کے لیے تن من کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ان کو بھیجنے کے لیے یہ سویٹر بُن رہی ہوں۔ جو مجاہد میرے ہاتھ کا سوئیٹر پہنے گا تو یہ طے ہے کہ وہ میری طرف سے جنگ کر رہا ہوگا۔ لہٰذا وہ میرا فوجی ہوا۔''

وسیم ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''وہ کتنا خوش نصیب فوجی ہوگا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''وسیم بھائی! کیا آج کوئی اچھا سا گیت نہ سنائیں گے؟''

ناہید اس کا موڈ بدلنے کی نیت سی بولی۔ اسے خدشہ ہو رہا تھا کہ یہ سنجیدگی کہیں کوئی گُل نہ کھلا دے۔

''میں تو ہر وقت تمھیں نغمۂ دل سنانے کے لیے مستعد ہوں بشرطے کہ تم میری ہمت افزائی کر سکو۔'' وسیم دل فریب انداز سے مسکراتے ہوئے بولا۔

ناہید کا چہرہ یک دم گلنار ہو گیا۔ ''اونہہ! تمھارا بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔

''صلح!'' وسیم نے اپنا سفید رومال جیب سے نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

ناہید کے لبوں پر ملکوتی تبسّم پھیل گیا۔ ایک نغمہ مدھر سروں میں اُبھرنے لگا۔ وسیم گاتا رہا اور ناہید نیچی نگاہ کیے سنتی رہی۔ غزل کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ اس کے رگ و پے میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ نغمہ فضاؤں میں تحلیل ہو کر ختم ہو گیا اور ناہید چونک اُٹھی۔

''اچھا ناہید! سر دست اتنا ہی کافی ہے۔ اگر چچی اماں کے کانوں میں آواز پہنچ گئی تو ہم دونوں پر وہ عتاب نازل ہوگا کہ توبہ ہی بھلی۔''

وسیم نے کہا اور پھر وہ ایک جست لگا کر کھڑکی سے باہر پھلانگ گیا۔

☆

وسیم اور ناہید بچپن ہی سے ایک جگہ رہتے آئے تھے۔ وسیم کے ماں باپ صغیر سنی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ چچا ابا کے پیار و شفقت بھرے سلوک نے ماں باپ کی کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا تھا۔ مگر چچی اماں کا رویہ قدرے سنگ دلانہ تھا۔ باجی نسرین، وسیم سے بڑی تھیں انھوں نے بے حد حساس اور خاموش طبیعت پائی تھی۔ ان کی زندگی میں والدین کی محرومی کا جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ کبھی پُر نہ ہو سکا۔ نسرین باجی کی بھری جوانی گھریلو کام کاج اور چچی کے روکھے پھیکے رویہ کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی۔

وسیم آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ اسے

چچا کے کمرے سے گفتگو کی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر کچھ ایسے فقرے اس کے کانوں میں پڑے کہ وہ چونک اٹھا اور ٹائی کا خیال چھوڑ کر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''میری آرزو تھی کہ نسرین کی شادی کے ساتھ ہی ناہید اور وسیم کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاتا۔ مگر تمھیں نہ جانے کیوں اختلاف ہے۔'' یہ چچا ابا کی آواز تھی۔

چچی اماں نخوت سے بولیں۔

''اس میں شک نہیں کہ وسیم بہت خوبیوں کا مالک ہے اور میں اس کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن میں آپ کے کہنے پر وہ قدم نہیں اٹھانا چاہتی جو ہمیں بعد میں پچھتانے پر مجبور کر دے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جس آرام اور عیش و عشرت میں ناہید پروان چڑھی ہے وہ ایک معمولی حیثیت والے انسان کے ساتھ کیسے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اگر وسیم کی کوئی بہت اچھی ملازمت ہوتی یا وہ دولت مند ہوتا تو شاید حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے۔''

یہ تمام باتیں سن کر وسیم کے ذہن میں دھماکا سا ہوا اور اسے اپنا دل سنگ ریزوں میں بٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے پھر چچا کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہے تھے۔

''بیگم! دولت اور ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا سب کچھ تو ناہید ہی کا ہے اور ناہید، وسیم کی ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ وسیم کتنا شریف اور قابل لڑکا ہے۔''

''بس آپ تو خالی شرافت ہی کا ماتم کرتے رہیں۔ میرے خیال میں وہ عورت کبھی بھی مطمئن اور خوش نہیں رہ سکتی جس کا شوہر بیوی کے ٹکڑوں پر پڑا ہو۔'' چچی اماں بارود کی مانند پھٹ پڑیں۔'' آپ کان کھول کر سُن لیں میرا یہ آخری اور اٹل فیصلہ ہے کہ ناہید کی شادی میرے بھتیجے احسان سے ہو گی۔ جو حال ہی میں ایس پی ہو کر لندن سے لوٹا ہے۔''

اس سے زیادہ وسیم میں سننے کی ہمت نہ تھی اسے یوں لگا کہ جیسے آسمان اس پر ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

جب اُمیدیں دم توڑتی ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے یہ سب کچھ سن کر صدمہ سے وسیم کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ قلزمِ عشق ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن وہ غم زدہ سا ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا اور یوں ہی چھت کی کڑیوں کو گھورنے لگا۔ کاری سے کاری زخم وقت کے ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں

مگر ہلکی سی ٹھیس لگنے پر وہ پھر رسنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ بھی ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس پریشانی اور غم زدہ ماحول میں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ اس کے دل پر ہجومِ غم و ملال تھا۔ وہ گریہ کناں رہا اور اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ کر تر بتر ہو گیا۔ اچانک باجی نسرین آ گئی تو اس کو کچھ تشفی ہوئی مگر پھر بھی وہ اپنا درد چھپا گیا۔

''بھائی!'' ''تم یہ اتنے افسردہ کیوں ہو، خیریت تو ہے؟''

باجی نے اس کی پیشانی سے بھیگے بالوں کو ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

وسیم نے باجی کی طرف غمناک نگاہوں سے دیکھا اور خاموش رہا جیسے قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔

ناہید پائیں باغ کے غربی کونے میں ہار سنگھار کے نیچے سر جھکائے مٹی سے بنے ہوئے ایک چھوٹے تاج محل کو رنگ برنگے پھولوں اور کلیوں سے سجا رہی تھی۔ مٹی کے اس چھوٹے سے تاج محل پر اچھی پینٹنگ بھی کی گئی تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریخ تھی۔ ہلکی ہلکی کرنیں تمام باغ میں پھیلی ہوئی تھیں رات کی رانی کی خوشبوئیں ہر سُو پھیلی ہوئی تھیں۔ چھوٹا تاج محل چاندنی میں چمک رہا تھا۔ وسیم بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''جانتے ہو وسیم اس کو؟'' ناہید نے مسرت سے تاج محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اس کے ساتھ ہماری کتنی ہی یادیں وابستہ ہیں۔ یہ ہمیں ایک ایسی خوش گوار صبح کے طلوع ہونے کا پیغام دیتا ہے جو ہمارے لیے مسرتوں کے چراغ روشن کر دے گی۔'' یہ کہتے ہوئے ناہید کا روئے تاباں گلگوں ہو رہا تھا۔

''ناہید! یادیں تو سمندر کی لہروں کی مانند ہوتی ہیں جس طرح لہریں کناروں سے آ کر ٹکراتی ہیں اسی طرح یادیں بھی قلزم دل سے ٹکرا ٹکرا کر طوفان بن جاتی ہیں۔ جہاں ماضی کی اور بہت سی حسین یادیں مٹ چکی ہیں... وہاں... اس تاج محل... کو بھی... برباد کر دو ناہید!''

وسیم کے لہجے میں دل کو پاش پاش کر دینے والا کرب تھا۔ وہ اندرونی طور پر انتشار اور کش مکش کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

''کیوں؟'' ناہید نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ سردی کے باوجود وسیم کی

کشادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ انتہائی غم زدہ نظر آ رہا تھا۔

ناہید کی نظروں کے سامنے ماضی کے وہ دن گھومنے لگے جن دنوں وہ کچھ عرصہ کے لیے اپنی خالہ کے ہاں گئی تھی۔ اور اس کی عدم موجودگی میں وسیم نے اس جگہ مٹی کا ایک تاج محل بنا دیا تھا۔ جہاں یہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ مٹی کا یہ تاج محل حقیقت میں دو دھڑکتے دلوں کی یادگار تھا۔ پیارا پیارا خوب صورت تاج محل! اور جب وہ خالہ کے ہاں سے واپس آئی تو وسیم اسے کار میں چھوڑنے آیا تھا۔ ناہید کی ممی نے خشمگین نظروں سے وسیم کو دیکھا وہ شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھیں اور غصہ سے بڑبڑانے لگیں۔ کتنا بدتمیز ہے بچی کو آرام کا سانس بھی نہیں لینے دیا۔

ناہید نے جب مٹی کے تاج محل کو دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو کر وسیم کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھوم گئی۔

''وسیم! تم تو شاعر کے علاوہ ایک عظیم فن کار بھی ہو۔ ہم دونوں اس یادگار کو ہمیشہ قائم رکھیں گے۔'' اور وسیم کو یوں محسوس ہوا کہ دنیا جہاں کی مسرتوں کا خزانہ بس اسی کے نام الاٹ ہو گیا ہے۔

اور اب جب وسیم نے اس تاج محل کو توڑنے کے لیے کہا تو وہ حیران نظروں سے وسیم کی جانب دیکھنے لگی جیسے اسے وسیم کے پاگل ہونے کا شبہ ہو رہا ہو۔

''لیکن گزشتہ سال جب آپ باہر گئے تھے تو کتنی سختی سے مجھے ہدایت کی تھی کہ ناہید! اس چھوٹے سے تاج محل کی حفاظت کرنا یہ مجھے بہت زیادہ عزیز ہے اس کے ساتھ ہمارے بچپن کی محبت وابستہ ہے اسے دیکھ کر میرے عزم میں ہمت واستقلال پیدا ہوتا ہے۔''

''ہاں! یہ تب کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔''

وسیم نے چاند کو تکتے ہوئے ملائم مگر کسی قدر دکھی لہجے میں کہا۔

''مگر آتش کے چہرے کے آس پاس بڑھاپے کے تو کوئی آثار نہیں ہیں؟''

ناہید نے مسکراتے ہوئے وسیم کے چہرے کی جانب اشارہ کیا۔

وسیم کے لبوں پر حزن میں لپٹی ہوئی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کے چہرے پر حزن وملال اور کرب کیوں ہے؟'' ناہید نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ چند دنوں بعد باجی نسرین جب اپنے سسرال سدھار جائیں گی... تو... میرے لیے کچھ بھی دل کشی نہ رہے گی اور پھر میرا وقت کیسے گزرا کرے گا باجی کی موجودگی مجھے ہمیشہ حوصلہ دیتی رہتی ہے۔'' وسیم کی گفتگو میں کچھ ٹال مٹول کی آمیزش تھی۔ وہ ناہید کو دل کے جلے پھپھولے نہیں دکھا سکتا تھا۔ ناہید بھی باجی سے جدا ہونے کا خیال کر کے افسردہ سی ہو گئی۔

''ناہی! فرض کرو میں یہاں سے یکایک غائب ہو جاؤں تو کیا تم مجھ کو یاد رکھو گی؟''

وسیم نے ہتھیلی پر یاسمین کی کلیوں کو رکھ کر انھیں سونگھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ لاحول ولا... پڑھنے سے پہلے ہی غائب ہو جائیں گے۔'' ناہید شریر ہی مسکراہٹ سے بولی۔ وسیم نے ناہید کو دیکھا پھر منہ پھیر کر چاند کو تکتے ہوئے کہنے لگا۔

یہ تو زمانے کی ریت رہی ہے کہ دولت مند ہمیشہ غریبوں کا مذاق اُڑاتے آئے ہیں اور تم بھی خوب مذاق اڑاؤ اور ہمارا مذاق اُڑا کر، تضحیک کر کے تم اپنی انا کی تسکین کرتی رہو۔''

''لاحول ولا... میں نے زندگی میں اتنی غیر مربوط گفتگو کبھی نہیں سنی ہر فقرہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!'' ناہید حیرت سے بولی۔

وسیم، ناہید کے چہرے کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔

''ناہی''

...''جی!''

...''ناہی!''... اس کی نظریں بدستور ناہید کے روئے تاباں پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب کہہ بھی چکو۔ ناہید شرارت سے بولی۔

''ناہی!'' دل کے ٹکڑوں کو پھول کی پتیوں سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں نا''...

''ہاں! تاہم یہ اپنا اپنا نظریہ ہے۔''

کچھ توقف کے بعد وہ بولا ''تم مجھے یاد کرو گی نا!''

''کیوں! کیوں نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔''

''اور میرا انتظار...'' وسیم نے پرامید نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"زندگی کے آخری سانس تک۔" ناہید ایک تاثر سے بولی۔

"مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔ تمھارا ساتھ قیامت تک کا ہے۔" وسیم نے یہ کہہ کر پُرجوش جذبات سے ناہید کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"بہت دُور اپنا مستقبل بنانے کے لیے پھر..." اس کی نگاہیں چاند کی طرف اٹھ گئیں۔

"پھر اس چاند سے بھی زیادہ روشن ہمارا گھر ہوگا۔ یہ چاند ہمیں آنے والی صبح کا پیغام دے رہا ہے۔"

"ہاں!" ناہید کی آنکھیں بھی چاند پر جم گئیں۔

بظاہر ان دونوں کے چہرے مطمئن اور تروتازہ تھے۔ مگر یہ عارضی سکون شاید کسی آنے والے طوفان کا پتا دے رہا تھا۔

چاند غروب ہوتے ہی وہ دونوں واپس لوٹے۔

وسیم اپنے دُکھ بھرے ماضی کو بھول کر سہانے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ نہ جانے کیا کیا سوچ ڈالتا اس کی جھلک اکثر و بیشتر ناہید کو بھی دکھلایا کرتا تھا۔ اور وہ مسرت سے جھوم اٹھا کرتی تھی۔

وسیم کو یقین تھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ضرور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوجائے گا اور پھر وہ ناہید کے ساتھ اپنی ایک الگ حسین جنت بسائے گا لیکن وسیم کو شاید یہ علم نہیں تھا کہ اس ملک میں بڑے بڑے عہدے تو صرف رشوت خان اور سفارش خاں کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

پھر وہ وقت بھی بہت جلد آگیا جب اس ناقدر شناس زمانے نے وسیم کی امیدوں کے تمام محل منہدم کردیے۔ اس نے اچھی نوکری کے لیے ہر طرف کوشش کی ہر اس ادارے میں انٹرویو دینے گیا جہاں اسے بلایا جاتا لیکن اس کی آرزوؤں کے محل بہت جلد منہدم ہوگئے اور وہ رولنگ اسٹون بن کر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف کی ٹھوکروں سے دل شکستہ ہوکر آخر کار فوج میں نام لکھوا دیا۔ کشمیر کے محاذ پر اس وقت ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو محاذ پر جاکر ملک و قوم کی حفاظت کرسکیں۔

باجی نسرین کو جب معلوم ہوا کہ اس کے بھائی نے فوج میں نام لکھوا لیا ہے تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"وسیم! یہ تم نے کیا کیا؟" باجی سسکیوں کے درمیان بولیں۔

"واہ میری باجی! بڑی بزدل ہیں۔ جہاد کرنا تو ہمارا عین مذہبی فریضہ ہے۔" وسیم مسکراتا ہوا بولا۔

"مزہ آئے گا۔ جب کسی کے حسین ہاتھوں کے بُنے ہوئے سوئٹر پہنا کریں گے۔" وہ دور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ جہاں دھندلکوں میں ناہید کے چہرے کا عکس اُبھر رہا تھا۔

تین ماہ کی ٹریننگ کے بعد اسے لیفٹیننٹ بنا کر محاذ پر بھیج دیا گیا اور یہ شاعرانہ دلگداز احساسات رکھنے والا گولیوں کی بوچھاڑ میں جان بازی و شجاعت سے ملک و قوم کی حفاظت کرنے لگا۔

محاذ پر توپوں کی خوفناک گھن گرج اور رعد جیسی کڑک بھی اس کے دل سے ناہید کا خیال کبھی نہ نکال سکی۔ جب بھی اسے ناہید کا خیال آتا تو اس کے دل میں لطیف سے جذبات جاگ اٹھتے اور رات کی تنہائیوں میں کسی پتھر پر بیٹھ کر روشن چاند کو تکتا رہتا تھا۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے بلکہ اس وقت دور ستاروں کی چھاؤں تلے کوئی دوسرا بھی اپنی حسین آنکھوں کو چاند پر گاڑے تک رہا ہے۔

بہادری و دلیری کے کارناموں کی وجہ سے وسیم کو ترقی ملتی رہی اور وہ چند سال بعد کیپٹن بن کر اپنے گھر واپس لوٹا۔

☆

ایک شام وہ ہزاروں امیدوں اور اُمنگوں کے ساتھ چچا ابا کے گھر پہنچا تو وہاں کی بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر اس کا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ شہنائیوں کی آوازیں سن کر اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وسیم نے اپنے آپ کو گہرائیوں میں گرتا ہوا محسوس کیا اور کئی لمحے اسی مدہوشی میں گزر گئے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگا تو اسے ماضی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"میرا بھتیجا احسان... وسیم سے زیادہ باعزت عہدے پر ہے... ناہید وہاں خوش رہے گی۔"

گویا امارت، غربت پر غلبہ پا چکی تھی...

باجی نسرین نے دوڑ کر وسیم کو گلے لگا لیا۔

"میرے بھائی! تم آ گئے۔ وہ اپنے بھائی کو پا کر بہت خوش تھی۔ آنکھوں میں آب دار موتی چمکنے لگے۔

"باجی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور مجھ کو اس ہنگامے سے بے خبر کیوں رکھا... میرے ساتھ اتنی غیریت... کیوں برتی گئی... مجھ سے بیگانوں جیسا سلوک کیوں کیا گیا۔"

وہ دکھوں کے ساگر میں ڈوب رہا تھا۔ اس نے ایک دم باجی کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی وہ گریہ وزاری کر رہا تھا۔

وسیم! مجھے بتاؤ کہ کیا میں تمھیں محاذ پر یہ لکھ بھیجتی کہ یہاں تمھاری آرزوؤں کا خون ہو رہا ہے۔ تمھارے ارمان لٹ رہے ہیں ان کا نظارہ کرنے کے لیے آ جاؤ۔ آہ! یہ مجھ سے نہ ہو سکا۔ تمھارے سپنے تو کافی عرصہ سے توڑے جا رہے تھے۔ آج تو... وسیم میرے بھائی"

باجی نسرین کی آنکھیں برسات بنی جا رہی تھیں۔

ڈھولک کی تھاپ گولی کی طرح وسیم کے سینے میں لگ رہی تھی۔ ڈھولک بجانے والے ہاتھ ڈھولک پر نہیں بلکہ اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے مار رہے تھے۔

وسیم نے دیکھا کہ دو سال کے بعد بھی اس کے کمرے کی وہی آب و تاب وہی آن بان تھی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اسی طرح صاف ستھری موجود تھی۔ اس کی تصویر کے گرد پھول بکھرے پڑے تھے نامعلوم اس کی پجارن کون تھی۔

وہ مغموم دل لیے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں شام کے دھندلکے میں ایک سایہ سا متحرک نظر آیا۔ وہ متحیر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ناہید!... اس وقت... تم میرے کمرے میں۔" وہ رک رک کر بولتا ہوا اس کے

سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

ناہید خاموش رہی وہ فرط گریہ سے کانپ رہی تھی اور رنج و الم کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے لب لرز کر رہ گئے اور اس کے مدھ بھرے نینوں سے آب دار موتی گرتے رہے۔

"ناہی! خدارا کچھ تو بولو۔ تمھاری اس خاموشی کو دیکھ کر میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

ناہید نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔ باوجود اندھیرے کے اس کے اشک وسیم کی نگاہوں سے چھپ نہ سکے۔ ناہید کے خوب صورت بال بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

"ناہی! پونچھ ڈالو ان اشکوں کو... تم نے تو آخری سانس تک میرا انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا؟" وہ اس کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ "اب یہ سب... کیا ہو رہا ہے... کاش تمھیں اس مجبور و لاچار مسافر کی بے بسی کا بھی کچھ احساس ہوتا جو تم سے بچھڑ کر زندگی کی پرخطر راہوں میں لٹ گیا ہے۔ یہ مسافر تم بن کیسے جی پائے گا؟" وسیم کی پیشانی آب یاس کے قطروں سے چمک رہی تھی۔

ناہید کہنے لگی۔

"وسیم ہم نے محبت کے عہد و پیمان کیے تھے میں نے اس شادی سے لاکھ انکار کیا، روئی، چیخی چلائی مگر میری آواز اور میری خواہشوں کا کسی نے احترام نہیں کیا۔ بھلا بلبل کی فریاد کون سنتا ہے؟ ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے میں تمھارا انتظار نہ کر سکی اور تمھیں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر علاحدہ ہو گئی۔ ہماری منزل ایک تھی۔ کاش! ہمارا راستہ بھی ایک ہوتا اور ہم ہمراہی ہوتے۔ وقت کسی طرح رُک جاتا، ٹھہر جاتا، میں نے اپنے دل اور خوشی کی خاطر خاندان کی عزت اور والدین کے وقار کو خاک میں نہیں ملایا... کئی بار خودکشی کا ارادہ کیا۔ مگر ہر بار اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر رہا۔ کیوں کہ خودکشی ہمارے مذہب میں گناہ کبیرہ ہے اور میں موجوں کے تلاطم میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی۔ خدا کے لیے وسیم تم لوٹ جاؤ۔ کیوں کہ جو تمنا میرے سینے میں سوئی ہوئی تھی تمھیں دیکھتے ہی وہ آتش فشاں کی طرح لاوا اُگلنے لگی ہے۔ میرا غم زدہ

دل کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے کیوں کہ میرے اندر کے باغی جذبے چیخنے اور سر پھوڑنے لگے ہیں۔''

ناہید سسکیوں کے درمیان آہستہ آہستہ بول رہی تھی جیسے کوئی دُور کنویں میں بول رہا ہو۔

''لیکن وسیم! میری یہ شدید خواہش ہے کہ ہم دونوں آخری بار اپنے بنائے ہوئے تاج محل پر پھول چڑھائیں۔ کیا خبر پھر مل بھی سکیں گے یا نہیں، کون جانے؟'' شدتِ غم سے ناہید کی آواز گلے ہی میں دبتی جا رہی تھی۔ اس نے کہا، ''وسیم! ہم ملے پھر بچھڑ گئے یہ کیسا دستور ہے زمانے کا۔''

وسیم بہت جذباتی ہو گیا تھا وہ کہنے لگا۔

''ناہی! اب مسرتوں کے خوابوں کو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ اس وسیم کو جس کے ساتھ تم نے بچپن کے حسین دن گزارے تھے۔ جب تم زندگی کی حسین منزل پر پہنچ جاؤ تو اس وسیم کو فراموش کر دینا جو غبارِ راہ کی طرح تمھاری راہوں میں پڑا ہے۔ ہم تو پتھر ہیں۔ اس لیے یہ دُکھ سہہ گئے۔ مگر تمھاری نازک ہستی یہ سب کچھ نہ سہہ سکے گی۔'' وسیم نے کہا اور بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔

''آؤ آخری بار ویران تمناؤں کو پروان چڑھائیں۔'' یہ کہہ کر وسیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُف! کس قدر یخ بستہ تھا اس کا ہاتھ۔ اسی لمحے وسیم کی نظریں ناہید کے چہرے پر پڑیں۔ اس کا حسین چہرہ بالکل زرد تھا۔ آنکھوں میں ویرانی اور سناٹا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اس کے تمام جسم میں سرد لہر سرایت کر گئی۔ مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ کر اس کے دل پر آرے سے چلنے لگے۔

''خدا کے لیے۔ وسیم اس لائٹ کو آف کر دو۔'' ناہید نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں نے ان اندھیروں کو اپنا مسکن بنا لیا ہے جن میں کھو کر اپنے ماضی کو بھول جاتی ہوں۔ مجھے ہر چیز سے وحشت ہوتی ہے۔ من کے اندر اندھیرا ہو تو باہر کتنا ہی چراغاں کر لیں اُجالا نہیں ہو سکتا۔''

''خدارا ناہید! ایسی دُکھی اور حسرت بھری گفتگو نہ کرو تمھیں ایک نیا گھر بسانا ہے۔''

''کیسا نیا گھر؟ جس کی بنیادیں ہماری آرزوؤں، تمناؤں کے خون پر رکھی گئی ہیں۔

پت جھڑ جیسا ہے میرا جیون۔''

ناہید اشک بہا رہی تھی۔ وسیم نے ڈرتے ڈرتے اچٹتی ہوئی نگاہ ناہید کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں کتنی ویران اور بے نور تھیں۔ وہ دونوں ڈگمگاتے قدموں سے بچپن کی یادگار کے قریب پہنچے۔ دونوں کے دل آنسو بن کر بہہ رہے تھے۔ کانپتے لرزتے چار ہاتھوں نے تاج محل پر پھول چڑھائے یاسمین و بیلا کی سفید کلیوں میں چھپا ہوا ننھا تاج محل مرقد معلوم ہونے لگا۔ اس کے اندر بھی تو دو دھڑکتے اور معصوم دلوں کی محبت مدفون تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ پھر گویا برسات کی جھڑی لگ گئی۔

''اُف! کس قدر تاریک رات ہے۔'' ناہید نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر میری سیاہ بختی سے بہت کم۔'' وسیم نے کہا۔

''ہمارا پیار تو عنکبوت کے جالے سے بھی زیادہ کم زور نکلا۔'' ناہید نے کہا۔

''ہاں! اب اندر چلو بوندا باندی سے تم کافی بھیگ چکی ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تم بیمار نہ پڑ جاؤ۔'' وسیم، ناہید کا سرد ہاتھ تھامے ہوئے اسے کمرے میں چھوڑ آیا۔

☆

ناہید دلہن بنی ڈولی میں بیٹھ گئی۔ وسیم نے بڑے حوصلے کے ساتھ ڈولی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

اس کی زندگی کو لُوٹ کر کوئی کس قدر مسرور تھا۔ کسی کے دامن میں ہے اندھیری رات، کسی کے آنگن میں کھلا ہے چاند۔ نوشتہ تقدیر پورا ہو کر رہا۔ وہ اپنی کائنات اپنی دنیا سے کٹ گیا۔

منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

یکا یک دولہے کا گھوڑا بدکا اور آناً فاناً محبت کی یادگار تاج محل کو پاؤں تلے کچلتا ہوا چلا گیا۔ وسیم نے محسوس کیا کہ جیسے گھوڑے نے اس کے دل پر سنگ باری کر کے چکنا چور کر ڈالا

ہے۔ یہ زمانے کی ایک اور ستم ظریفی تھی۔ آخری یادگار بھی نہ رہنے دی۔ حسرتوں کے مزار کو نیست و نابود کرڈالا۔ بچپن سے ایک ہی ڈگر پر چلنے والے دو راہیوں کو ظالم سماج نے ایسے خاردار راستے پر لاکر پھینک دیا کہ جہاں وہ ہاتھ پاؤں بھی نہ مار سکے۔

چاند اب دُور پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔

''وسیم! رات بیت چکی ہے اور پورنماشی کا چاند بھی دور افق میں آرام کے لیے جا رہا ہے۔ اب تو کمرے میں چلے آؤ۔'' باجی نسرین کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

وہ چونک اٹھا۔ اور آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے یوں گرے جیسے خزاں کی ہوائیں خشک پتوں کو شاخوں سے بڑی تیزی سے گرا دیتی ہیں۔ وسیم نے الوداعی نگاہ چاند پر ڈالتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔